یادوں کے جھروکے

OF THE REGISTRAR OF
47
3-02
PRADESH, HYD.
హైదరాబాద్-12.

لمحے یادوں کے

اب تو
بہت دن بیت چکے ہیں
پھر بھی
یاد آتے رہتے ہیں اکثر
ہر دن ہر رات
اُٹھتے بیٹھتے
سوتے جاگتے
وہ بے چین سے لمحات
زندگی کی طویل رفاقتوں میں
خاموش لبوں پر مہر بہ سکوت ہیں
کبھی ٹوٹ بھی سکتے ہیں!

اُس دن
کیسے جان پاتا میں کہ
راستے میں ہی تھک کر
سیڑھیوں کی ریلنگ کو تھامے
سیڑھیوں پر ہی بیٹھے بیٹھے
کوئی الفاظ نہیں
کوئی اشارہ نہیں
بڑی حسرت سے تم نے مجھے دیکھا تھا
کیسے جان پاتا میں کہ

ٹکٹکی باندھی تمہاری ان
حسین آنکھوں میں
خاموش آنکھوں میں
معلوم نہیں
کیا پیغام تھا اُن میں۔
پھر دیکھتے ہی دیکھتے
نگاہیں اُٹھالیں
اُوپر بہت اُوپر
حسرت سے
خاموشی سے
اور میں دیکھتا رہ گیا
تعجب سے
جان نہ پایا تھا میں
زندگی کی اتنی کم مائیگی کو
جو اتنی مختصر نکلی
اور میں روتا دھوتا رہ گیا
ایک بچے کی طرح
جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو

ہم محبت کے ماروں کا
دل کے اجڑنے سے اکثر
یہی حال ہوتا ہے
ہم مثل تاج جیسی
نقاشی میں ڈوبی ہوئی
کوئی حسین عمارت نہیں چھوڑتے
عمارت کی تفسیر چھوڑ جاتے ہیں
تحریر کے فن میں کہ
آؤ دیکھو کھو جاؤ
ان بھول بھلیوں میں
جو نثر سے عبارت ہیں
یہاں زہرہ کی بڑی بڑی آنکھیں
دیکھ رہی ہیں
اور میں سیاہ قلم سے
اُن آنکھوں میں
کاجل کی دھار
کھینچ رہا ہوں
مرمریں ہونٹوں پر
پان کی لالی سجا رہا ہوں کہ
کپکپاتے تھرتھراتے ان ہونٹوں پر
ہونگے کچھ سوال
اور میں قلم کی روشنائی سے
اُن ہونٹوں پر
لکھوں گا کوئی جواب
یہی ابتداء ہے

یہی انتہاء
اور یہی میرے خواب

اس طرح
جب بھی حسین خوابوں سے
دل کی دھڑکنیں
لب ڈب لب ڈب کرتی
کانوں میں گونجا کرتی ہیں
جب بھی بندھی کلائی سے
ٹک ٹک ٹک ٹک کرتی گھڑی
ذہن کے گوشوں کو
جگایا کرتی ہیں
میں لکھتا رہوں گا
بے تکان
جب تک دل کی دھڑکنیں رک نہ جائیں
جب تک سانسوں کے زیر و بم تھم نہ جائیں
اور میں لب بہ مہر
خاموش نہ ہو جاؤں

۱۶/نومبر ۲۰۰۱ء

زہرہ مسحور

انتساب

۸ر ڈسمبر
۲۰۰۰ء
۱۱ر رمضان
۱۴۲۱ھ
بروز جمعہ
ساعت ۸ بجے
شب

بنام
یادوں
کے
لمحے

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کتاب کو تمہارے نام منسوب کرنے جارہا ہوں تو اس بارے میں کیا لکھوں۔ لکھنے سے پہلے میں نے ذہن میں اور لبوں پر قرآن حکیم کے اس شروعاتی ترجمہ کو دہرایا ہے شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ بس یہ اس کا کرم ہے کہ اُس نے میرے قلم کی رہنمائی کی اور اس میں جدائی کے لمحات ہی وہ محرک ہیں تمہاری یاد کے جو اس کتاب کی تحریک کا باعث ہوئے ہیں۔ جب ہم ملے تھے تو حد سے زیادہ خوشی ہوئی تھی اور اب جدا ہوئے ہیں تو حد سے زیادہ غمی ہے۔ تمہارے بھائی زین العابدین صاحب بھی تمہیں بھلا نہ پائیں ہیں۔ بڑی دور رہ کر بھی خیال رکھنا محبت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ ان کا بھیجا ہوا ڈرافٹ تمہارے وصال کے بعد وصول کر کے تمہاری یاد میں کتنا تڑپ اُٹھا تھا میں کہ یہ ہمیشہ تمہارے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں آتا تھا اب تمہارا ہاتھ بیچ میں نہیں ہے تو میں خود کو یکا و تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ یہی حقیقت ہے۔

لیکن خوابوں کی دنیا کو کیا کہوں کچھ عجیب سا وسیلہ ہے یہ جس میں ہم ملتے بھی ہیں باتیں بھی کرتے ہیں جاگتے ہیں تو کچھ یاد رہتا ہے کچھ یاد نہیں رہتا۔ یاد رہا یاد آیا تو کہہ دوں گا۔ دیکھو یہ کتاب میں نے تمہاری یادوں سے منسوب کر دی ہے۔ اس میں ہم اکھٹا پردوں کے پیچھے چھپے رہتے تھے اکثر تم بولتے تھے اور میں سنتا تھا۔ اب میں بول رہا ہوں تم سن رہی ہو یا نہیں اس کا احساس نہیں تاہم میں بولوں گا تمہارے سننے کا احساس رہے یا نہ رہے۔ بس یہی ایک وسیلہ بچا ہے خوابوں سے سننے سنانے کا......

۱۳ر نومبر ۲۰۰۱ء

زہرہ مسحور

لَقَدْ خَلَقْنَا الِاْنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم ط

بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا بہترین سانچہ میں ڈھال کر (القرآن)

یہ خالق کی عظیم ترین تخلیق ہے کہ اس نے انسان کو اس طرح پیدا کیا گویائی سکھائی اور قرآن کی تعلیم دی۔ بے شمار نعمتیں دیں۔ پھر اس کا بار بار یہ سوال کرنا اپنی نعمتوں کو گرداننے کہ تم ہماری کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اس طرح بار بار کی ایسی تکرار سے کیا یہ کافی نہیں کہ اس کی وحدت کے عظمت کے اس میں کئی ثبوت ہیں۔

حسنِ ترتیب

یادِ رفتگان

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ علی سردار جعفری کی شاعری چونکا دینے والی ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی ایک طویل و مشہور نظم ''میرا سفر'' کی آخری بندش میں اپنی زندگی میں ہی خود کے ''امر'' ہو جانے کی بشارت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

یہ خود اعتمادی کی رسائی ہے جو ذہن کے دریچوں سے از خود ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل آتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جوان دریچوں کو از خود بند کر لیتے ہیں کچھ کہتے نہیں مستقبل کے بارے میں تو کیا وہ امر نہیں کہلاتے! کہلاتے ہیں دوسروں کی زبانی جب خود نہیں کہتے ان لوگوں میں انیس دہلوی بھی ہیں جو مرحوم ہو کر امر ہو گئے ہیں' وہ ادبی سفر میں خود اکیلے نہیں تھے' ان کے پیچھے ادبی جہت کا ایک بڑا کارواں تھا' اس طرح کہ۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

وہ نئے سال سے ایک دن قبل ۳۰ رڈسمبر ۲۰۰۰ء کو دار فانی سے کوچ کر گئے اسی مہینے ۸ رڈسمبر ۲۰۰۰ء کو ٹھیک (۲۳) دن قبل میری شریک حیات زہرہ میرے ہاتھوں میں ہی میری نظروں کے سامنے جنت سدھار گئیں۔ ان دونوں ہی حادثوں نے یادوں کے طویل سفر کو ایک سفر نامہ جیسی کہانیوں کی بندش میں جو محوِ سفر تھیں میرے ساتھ ساتھ' لکھا ہے بس یہی قلیل سا سرمایہ ہے کمیاب و نایاب جو بچ رہا جب کہ اکثر گمشدہ ہے۔ جو کچھ ہے......

یہی ابتداء ہے
یہی انتہاء
اور یہی میرے خواب

۸ رڈسمبر ۲۰۰۱ء

زہرہ مسحور

زین العابدین صاحب

ہمارے محسن

آپ ہیں ہمارے محسن، ہم سب کے محسن، ہم تمام افراد کے محسن، میری منظورِ نظر زہرہ کے بھائی محترم زین العابدین صاحب، وہ جب بھی خط لکھتے ہیں تو سب کو فرداً فرداً یاد کرنا نہیں بھولتے۔ ہیں تو انجینئر بلڈنگوں کے، لیکن ہر فرد کو انجینئر کی نگاہ سے تاکنا کہ دم خم کتنا ہے اس انسانی ڈھانچہ میں جو ڈھو سکے زندگی کے بار کو، خاصہ محبوب مشغلہ ہے۔ پھر خود اندازہ بھی کر لینا اور ہر سال کچھ نہ کچھ خاصی رقم ارسال کر دینا نیکوکار حضرات جیسی عین اچھی فطرت انسانی کی معراج ہے--- زہرہ کو بہت انتظار رہتا تھا اپنے بھائی کے خط کا کہ اس میں بہن کے نام ایک ڈرافٹ ضرور ہوگا۔ اور جب خط مل جاتا تب خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا تھا۔ ہم سب کو خوشی کے ساتھ تعجب اور احساس بھی ہوتا کہ خط کے ساتھ بھاری رقم کا ہونا کوئی کھیل نہیں۔ خط پڑھ کر تو آنکھیں بھیگ جاتیں۔

اتفاق سے کل ہی کاغذوں کے ذخیرے میں سے تلاش پر ان کی ایک فوٹو مل گئی تو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ کتنی گہرائی ہے ان آنکھوں میں، ان کے سوالیہ انداز میں کہ جیسے دہن نہیں بلکہ آنکھیں کچھ بول رہی ہیں، کچھ کہہ رہی ہیں، اس خیال سے کہ تصویر پھر ہاتھ نہ لگے محفوظ کر لیا کتاب میں کہ سند رہے، جو ہمارے محسن، ہم سب کے محسن ہم تمام افراد کے محسن ہیں کہ۔

اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشمِ جاناں نہ کہیں

(مجروحؔ)

۱۹/فروری ۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

۷ستمبر ۱۹۳۰ء

۳۰ڈسمبر ۲۰۰۰ء

الحاج نعمت اللہ انیس دہلوی

جاتے جاتے دے گئے ہم زندگی کو رنگ و نور رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا فسانہ ہم

ہمہ گیر و ہمہ جہت، گونا گوں تصورات کے حامل الحاج نعمت اللہ انیس دہلوی، ادبی حیثیت سے اور تصور و تصویر میں ڈھلے، ادائے بیباکی کے ساتھ بزرگی، متانت و سنجیدگی سے، آنکھوں کی ایسی تابناکی سے، ذہن کے مخصوص انداز سے، جب بھی دیکھیں ان کی تصویر، لگے گا ابھی ابھی اسی انداز سے بول پڑیں گے۔ ارض پر نہ سہی اپنے کلام میں۔ کسی کا بھی کلام جو گذر چکے ہیں، پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں اوروں سے، کبھی سن چکے ہیں اُن سے تو یوں ہی لگے گا کہ وہ بول رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں ان کے کلام کا ایک نمونہ پڑھیئے اور گہرائی کے ساتھ اس سچائی کو آزمایئے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انسان چلا جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے آواز کی لئے اور اتار چڑھاؤ کی لہریں چھوڑ جاتا ہے دماغ میں اور یہی لہریں دماغ کی گرفت سے چھوٹتی نہیں، محفوظ رہتی ہیں --- کاش! میں ایک وقت ہی سہی انہیں سنا ہوتا تو میرا دماغ ان کی آواز کی لہروں سے آشنا رہتا --- گرچہ وہ کچھ سالوں سے پوری طرح سماعت سے محروم ہو چکے تھے ایسا انہوں نے مجھے لکھا تو خیال آتا ہے ان دنوں شائد یہ اپنی آنکھوں سے پڑھ بھی رہے ہوتے ہوں گے اور سن بھی رہے ہوتے ہوں گے۔ یہ بھی سچ ہے کہ سماعت سے محرومی، سوجھ بوجھ تخیلی طاقت سے ان سنی سماعت کا پیغام بینائی کی گذرگاہوں میں پہنچا دیتی ہیں۔ اپنے ایک شعر میں کچھ ایسا ہی خیال انہوں نے باندھا، شعر ہے۔

چہرے کا تاثر تو زمانے کے لئے ہے پڑھئے میری آنکھوں میں جو پیغام لکھے ہیں

میں اپنی طرف سے ایک شعر مرحوم کے نام ان کی ادائے بیباکی پر منسوب کرنا چاہوں گا۔ مجروحؔ سلطان پوری کا شعر ہے، جو خود بھی ایک بیباک شاعر تھے۔

سکھائیں دست طلب کو ادائے بیباکی پیام زیر لبی کو صدائے عام کریں

(مجروحؔ)

۲۰رمئی ۲۰۰۱ء

زہرہ مسرور

به قلم خود

تعارفی خلاصه

ایک دوجے میں

اوپر دیکھلائی دے رہی دونوں ہی تصویریں بازو بازو بہ عنوان ''ایک دوجے کیلئے'' تھیں اور ہیں۔ تھیں اس لئے کہ اُس میں سے ایک' دوجے کو داغ مفارقت دے گئیں۔ اور ہیں اس لئے کہ اب وہ دوجے کے نام کے ساتھ منسلک ہیں آج بھی یعنی ''زہرہ مسحور'' کے نام سے اور یہ بھی کہ مرد کے نام کا عورت کے نام سے منسلک رہنا ادبی حیثیت سے ایک نرالی اور اچھوتی ترکیب ہے اپنی بیوی کو بھلا نہ پانے کی ادبی میلان ومیدان میں یہی وجہ ہے کہ زہرہ تو نہیں ہیں لیکن ہیں میرے نام کے ساتھ اور میں لکھ رہا ہوں ان کی یاد کے سہارے اور تب تک لکھتا رہوں گا جب تک دل کی دھڑکنیں تھم نہ جائیں اور میں لب بہ مہر خاموش نہ ہو جاؤں۔

میرا یہ دوسرا مجموعہ زہرہ کی جدائی کے لمحات بیتی یادوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ سچ ہے کہ زہرہ مجھے گر داغ مفارقت نہ دے گئیں ہوتیں تو مجھے اس عمر میں اس مجموعہ کو ترتیب دینے کا خیال خواب وخیال میں بھی نہ آتا۔ بس یوں کہ۔

آخر غم جاناں کو اے دل بڑھ کر غم دوراں ہونا تھا
اس قطرے کو دریا بننا تھا اس موج کو طوفاں ہونا تھا

(مجروحؔ)

۱۹ر فروری ۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

رحمت یوسف زئی

پروفیسر وصدر، شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

چند باتیں

زہرہ مسحور----- اس نام کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی خاتون کا نام ہوگا۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ نام کسی خاتون کا نہیں بلکہ ایک جہاں دیدہ مرد کا ہے جس نے چونسٹھ گرم وسرد موسم جھیلے ہیں تو میں حیرت میں ڈوب گیا۔ جب میں نے ان صاحب زادے سے دریافت کیا جو اس کتاب کا مسودہ میرے ہاں لائے تھے، تو پتہ چلا کہ یہ محمد رشید احمد کا قلمی نام ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں ایسی ایک اور مثال ملتی ہے کہ میراجی نے اپنی محبوبہ کے نام کو اپنا قلمی نام بنالیا تھا۔

زیرِ نظر مجموعے میں کچھ افسانے ہیں، کچھ نظمیں، کچھ تاثرات اور کچھ شخصیات پر لکھے گئے مضامین۔ فن کار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خود بھی اپنی تخلیق میں موجود ہوتا ہے اور اس کے اندر کسی کردار کے روپ میں، کسی واقعے، کسی چیز یا خیال کے توسط سے اپنا احساس دلاتا رہتا ہے۔ زہرہ مسحور کی تحریریں پڑھیئے تو محسوس ہوگا کہ وہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طرح موجود ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی سے قلم کے لئے تحریک حاصل کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اگرچہ انکی اہلیہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں لیکن ایسے لگتا ہے جیسے وہ رشید احمد کے اندر داخل ہوگئیں ہیں۔ محبت کا ایسا عجیب اور دلکش نمونہ شاید ہی کہیں ملے۔ یادیں زندگی کا سب سے اہم سرمایہ ہوتی ہیں جو ذہن کے تمام جھروکوں سے جھانکتی رہتی ہیں۔ یہ یادیں ہی ہیں جو خواب کی گہرائیوں میں رقص کناں ہوتی ہیں۔ تنہائیوں کی ساتھی اور ہم دم یادیں ہی تو ہیں جو ماضی اور حال کو آپس میں مدغم کردیتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب انہیں یادوں کے جھروکوں کی دھندلی دھندلی تصویروں پر مشتمل ہے۔

اخبارات کے لئے طنزیہ اور مزاحیہ کالم لکھنے کا عمل ایک خاص قسم کے سلیقے کا طالب ہوتا ہے۔ کالم

نگار کے لئے اخبار میں چھپی ہوئی کوئی بھی خبر تحریک کا سبب بن سکتی ہے۔ زہرہ مسحور کے تاثرات اخباری کالم ہی کی طرح ہیں۔ ان کی تحریروں سے یہ اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر تحریر کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی خبر ضرور ہے۔ ان کے سارے جھروکے کسی نہ کسی خبر پر ہی مبنی ہیں۔ وہ جب ایک ایک جھروکے کو کھولتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ہم مختلف اوقات میں ہونے والے اہم واقعات کی ایک جھلک دیکھ رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ پیاز کی قلت نے اس کی قیمت کو آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ پہلا جھروکہ اسی موضوع پر ہے۔ دوسرے جھروکے میں پارلیمانی الیکشن میں دیئے گئے انتخابی نشانات کی بات چھیڑی گئی۔ زہرہ مسحور نے اس کتاب میں کئی جھروکے کھولے اور ہر جھروکے میں کسی نہ کسی اخباری اطلاع کو بنیاد بنا کر طنز کے تیر چلائے گئے ہیں۔

نظموں میں ''مسلمان اور مساوات'' ہر ہندوستانی مسلمان کی آواز ہے جو مظلوم ہے، بے بس ہے لیکن اسے اس بات پر فخر ہے کہ وہ ہندوستانی ہے۔ اس مجموعے میں شامل ایک اور نظم ''وہ کوئی اور نہیں'' گیارہ ستمبر کے اس اہم واقعے پر لکھی گئی ہے جس نے دنیا بھر کو چونکا دیا تھا اور بڑی طاقتیں لرزہ براندام ہوگئیں تھیں۔ زہرہ مسحور نے اس واقعے کی پشت پر اسرائیل کو ذمہ دار گردانا ہے۔ نظم طویل ہے لیکن دل کو چھولیتی ہے۔ ٹکنک کے اعتبار سے اسے نثری نظم کہا جاسکتا ہے۔

جہاں تک افسانوں کا معاملہ ہے زہرہ مسحور کے افسانے منٹو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہی لہجہ، وہی موضوعات، ظاہر ہے کہ منٹو جیسے فنکار کو چھونا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں۔ پھر بھی زہرہ مسحور نے نفسیاتی الجھنوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ منٹو اپنی طرز کا پہلے اور آخری افسانہ نگار رہے۔ شاید یہی بات زہرہ مسحور کے لئے بھی کہی جائے کہ وہ منٹو کے پہلے اور آخری پیرو ہیں۔ ان کا افسانہ ''ہونی انہونی'' منٹو کے شہرہ آفاق افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' کے کینواس پر اُبھرنے والی تصویر ہے جہاں ایشر سیاں'' الف خاں میں بدل گیا ہے۔ لیکن افسانے کا انجام جس خوبصورتی سے منٹو نے کیا تھا وہ شاید اسی کا حق تھا۔ ''نفسیاتی معالج'' بھی کچھ اسی طرح کا افسانہ ہے۔ جس کا مرکزی کردار ایک لاش کے ساتھ جنسی عمل کے خود کو ناکارہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ منٹو کی کلونت کور اپنے شوہر ایشر سیاں کو قتل کردیتی ہے۔ اور قاری کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے قتل کیوں کیا۔ کیا اسے لئے کہ کلونت کور کی جنسی تسکین نہ ہو پائی۔ کیا اس لئے کہ ایشر نے ایک لاش کو اپنا شکار بنایا تھا۔ کیا اس لئے کہ ایشر اب اس کے لئے ناکارہ ہوگیا ہے۔ یا پھر کیا اس لئے کہ کلونت کور صنف نازک کی نمائندہ بن کر ایشر

نیاں جیسے خطرناک درندہ صفت مرد کے خلاف نفرت کی بجلی بن کر کوندگئی۔ زہرہ مسحور نے اس کہانی میں ایسا کوئی سوال کھڑا نہیں کیا۔ انہوں نے اس کہانی کے مرکزی کردار کونا کارہ ہو جانے کے بعد مصنوعی طریقے سے تسکین پہنچانے کی کوشش کرتا بتایا ہے۔ لیکن اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عورت کی نفسیات کچھ عجیب وغریب ہوتی ہے۔ وہ راکھ سے چنگاری پیدا کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ اور شاید یہی ان کی کہانی کا مرکزی نکتہ ہے۔

آج کے اس بلاخیز دور میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اُردو کی کتاب شائع ہونے کے بعد قاری تک پہنچ بھی پائے گی یا نہیں کیوں کہ آج کے زمانے میں قاری کا فقدان ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ زہرہ مسحور اپنے جذب کامل سے بچے کچے قاری کو متوجہ کرلیں گے اور اپنے والہانہ جذباتی اظہار کے ذریعہ ذہنوں پر کچھ اثر بھی چھوڑ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ اثر منٹو جیسا دیرپا نہ ہو لیکن پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ سوچنے کے لئے انہوں نے کچھ راہیں تو سجھائی ہیں۔

☆☆☆

میرے وہ بیتے ہوئے دن......

جب اپنی خودنوشت لکھنے جارہاہوں تو یادوں کا ایک سناٹا ہے جو دل ودماغ میں ایک ہلچل سا مچائے ہوئے ہے۔ جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک کنکر مار کر ارتعاش پیدا کردیا گیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ داستان گو کی طرح شروعات کہاں سے کروں......

ایک شعر ہے۔

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں حافظہ کی چھین جانے والی بات تو نہیں کروں گا' بات کروں گا یادوں کی جو حافظہ میں محفوظ ہیں اور شروعات کروں گا اپنی پیدائش سے کہتے ہیں میری پیدائش حیدرآباد کے مشہور وکٹوریہ میٹرنیٹی ہوم میں ہوئی۔ اور یہ بھی کہتے ہیں میں بہت موٹا تازہ گورا گمٹا تھا۔ ۹/اگسٹ ۱۹۳۸ء پیدائشی تاریخ ماہ وسال ہیں نام رکھائی میں اور تعلیمی دستاویزات میں نام ہے محمد رشید احمد والد محمد قاسم صاحب مجھے یاد ہے بڑے ہونے سے پہلے ہی ایک خالہ نے جو حیدری بیگم کے نام سے موسوم تھیں اور جن کی کوئی اولاد نہیں تھی مجھے نہ صرف گود لے لیا بلکہ نام رکھ دیا ''میر مظفر علی خان'' نوابی جاگیردار گھرانہ تھا اور اہل تشیہہ۔ سنت الجماعت ہوکر جائز یا ناجائز ''الموں'' کے آگے سینہ کوبی بھی کی ہے بچپن میں چونکہ والد اور والدہ کی تعلیمات سنت الجماعت تھیں اس کی طرف راغب ہوگیا دل سے ہوش سنبھالنے کے بعد خالہ بھی انتقال فرماگئیں جب مری مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ جوان ہوا تو پر جوش ہوا کہ ہمالیہ سرکرلوں۔ اتنا دوڑوں اتنا بھاگوں کہ انگ انگ سے پسینہ پھوٹ نکلے۔ پڑھائی سے زیادہ مجھے مطالعہ دلچسپ لگتا تھا۔ شروع شروع میں تو کہانیاں بہت پڑھا کرتا تھا اور جب بھی گھر میں کوئی تقریب ہوا کرتی تھی تمام ہم عمر بچے مجھے گھیر لیتے تھے کہانی سنانے کیلئے اور میں ان کے درمیان گھرا بیٹھا گھنٹوں کہانیاں سنایا کرتا تھا اپنی خود کی ذہن میں اُسی وقت پیدا ہوتی ہوئی کہانیوں کو سب بغور حیرت سے سنا کرتے تھے اور میں ایک داستان گو کی طرح سنایا کرتا تھا۔ بڑا ہوا تو صادق حسین سردھنوئی کے ناول پڑھنے لگا۔ جس کو

والد صاحب خود کے مطالعے کے لئے لائبریری سے لے آتے تھے۔ دادا محمد اعظم صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ بہت ساری کتابیں ان کے ڈرائنگ روم میں آئینوں والی مضبوط و خوش وضع چوبی الماریوں میں سجی رہتی تھیں۔ ورثہ میں والد صاحب کو یہ سب کچھ تو نہ ملا صرف مطالعہ کا شوق دیگر بیٹوں کو نہیں والد صاحب کو ملا۔ والد صاحب دادا صاحب کی پہلی بیوی سے اکلوتے رہے اور وہ انتقال فرما گئیں والد صاحب کے بچپن میں ہی۔ تاہم دیگر بھائیوں' بہنوں میں والد صاحب عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور یوں گھر ہمیشہ ایک گلدستے کی طرح سجا رہتا تھا۔ ہم تین بھائی رشید' مسعود' سعید بڑے پیار سے دادا صاحب کی زبانی پکارے جاتے تھے۔ رشیداں' سعیداں' ومسعوداں تو ہمیں اپنے ناموں سے زیادہ یہ نام پسند آتے تھے ان کے دیئے ہوئے۔ ہم تینوں بھائیوں کو یہ بڑی خواہش رہتی کہ ہماری ایک بہن بھی ہو۔ اور دعائیں مانگتے رہتے۔ کہتے ہیں خدا بچوں کی دعائیں سن لیتا ہے اس لئے اُس نے عرصہ بعد ہی سہی ایک بہن سے ہم کو نواز دیا۔ نام تو عزیزہ بیگم ہے اگر دادا صاحب زندہ رہتے تو وہ لاڈ سے پکارتے عزیزاں۔ ہماری بہن اب بھی ہم کو اتنی ہی عزیز ہے جتنی بچپن میں دو بیٹوں ایک بیٹی اور اپنے شوہر ملک محمد عباس علی خان (پی آر او) کی محبت میں مگن۔ ملک صدیق علی خان' ملک محمد علی خان ان کے دو بیٹے' اب ایک ایک بیوی کے وارث ہو چکے ہیں رضوانہ وفوزیہ دونوں ہی حسین ہیں کردار و گفتار سے بھی مزین رہیں تو سونے پہ سہاگہ بیٹی فرح کا گھر بس چکا ہے شوہر تکی ہیں دونوں ایک دوسر کے چہیتے' دو بیٹے اسد و باسط اور ایک بیٹی نورین بڑی پیاری۔ خود ہماری فیملی کتنی پھیل گئی ہے بڑا لڑکا توفیق ان کی بیوی عائشہ منہاج کو چاہیے کہ وہ گھر کو گھر سمجھیں' جھوٹ بولنا ترک کریں بزرگوں کے ساتھ عزت و ادب کو ایمان کا جز سمجھیں۔ ان کے پھول سے چار بچے اعظم' خرم' کاظم اور معظم چھوٹا لڑکا یونس ان کی بیوی مسرت دونوں ہی ایک جاں دو قالب بڑوں کا پاس و لحاظ بدرجہ اتم اور بیٹی عائشہ تبسم (لاڈ سے عاشی) بڑی لڑکی صوفیہ شوہر انور الدین خان (نواب شہامت جنگ کے سلسلے سے) بچے رضی' مسیح' شجیع' اور لڑکی اذیبہ زینت کسی کونے میں بھی کھڑا کر دو تو وہ کونا سج جائے۔ سب ابھی زیر تعلیم ہیں رضی میاں میرے سے بھی آگے نکل گئے۔ انہوں نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں نکالا ہے اب انٹر میں ہیں کچھ میاں مسعود کے بارے میں جو میرے چھوٹے بھائی ہیں یو ڈی اکاؤنٹنٹ کا گزیٹیڈ پوسٹ ہے تنخواہ معقول ہے۔ کھانے والے کوئی نہیں۔ اولاد نہیں ہوئی ہے شادی کے بتیس (۳۲) سال بعد بھی اور نہ ہی اب کوئی توقع ہے کہ گلشن میں بہار آئے۔ بیوی احمدی میں برداشت کا مادہ نہیں ہے تاہم یہ کوئی کمزوری نہیں ہے۔ اخلاق' تہذیب' محبت جیسے کئی مادوں کو چھوڑ کر بس رہے ہے نام اللہ کا سی زندگی ہے۔ بڑے بھائی بحرین میں انتقال فرما گئے جو شفقت میں پدرانہ محبت سے کچھ کم نہیں تھے۔ ن کی بیوی ہماری بھابھی واقعی کردار و گفتار کی ملکہ ہیں۔ ایک بڑی فیملی کی ہیڈ مسٹرس

جیسی دو ہی لڑکیاں طاہرہ' زاہدہ چار لڑکے نذیر' بشیر' شفیع اور منیر' سب کے سب اپنی اپنی زندگیوں سے لگ چکے ہیں فون پر کبھی کبھی بات چیت ہو جاتی ہے بس' زندگی بہت تیز رفتار ہو گئی ہے رشتوں کو گناتے گناتے اس کی تیز رفتاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

اب گردش ایام کو اور پیچھے کی طرف لیئے چلتا ہوں تو یہ دور کچھ عجیب سا دور ہے جس میں چرند پرند' جھاڑ پہاڑ انسان تو انسان سب خوبصورت لگنے لگتے ہیں۔ وحشت نامی کوئی جذبہ نہیں رہتا سوائے محبت کے یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے جب صادق حسین سردھنوی کے ناولوں میں عشقیہ حصے پڑھنا جنگ و جدال کی باتوں سے زیادہ اچھے لگتے تھے بلکہ کورس کی کتابوں سے بھی زیادہ اچھے اور ایک دن ایسا ہوا پھوپھی صاحبہ کی شادی کے بعد ایک نئے چہرہ کو جب میں کتاب پڑھ رہا تھا کتاب کو اوٹ سے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا وہ مجھ سے کچھ بڑی یا پھر چھوٹی ہونگی مجھ میں اتنا شعور ابھی جاگا نہیں تھا کہ کچھ اندازہ کر سکوں' بس قصہ حاتم طائی کی طرح تجسس جاگا تھا...... "ایک بار دیکھا تھا دوسری بار دیکھنے کی خواہش ہے" ایک بار ماں سے پوچھ بھی ڈالا' ماں! وہ کون لڑکی ہے جو کل یہاں آئی تھیں۔ ماں نے بتلایا تمہاری پھوپی کی نند۔

بہن ابھی چھوٹی تھیں ماں کا ہاتھ بٹانے گھر کے بیشتر کام کاج جھاڑو جھٹکا' برتن دھونا ہم ہی کر لیا کرتے تھے تو جب بھی وہ آتیں ہم کو اس طرح مصروف بہ کار دیکھ کر اچھنبے میں پڑ جاتیں پھوپھی صاحبہ سے معلوم ہوا ہم کو اس طرح لڑکے ہو کر بھی ان کاموں کو انجام دینا جو لڑکیوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اچھنبے و حیرت کے ساتھ انہیں اچھا بھی لگتا ہے۔

اس طرح ماہ و سال بیتتے گئے بڑے بھئی صاحب کی شادی ہو گئی۔ ہم نے میٹرک نکال لیا ایک بار فیل ہوئے دوسری بار سکینڈ ڈیوژن سے تلگو میں ایکہتر (۷۱) نمبر لے کر اسکول میں پہلا درجہ حاصل کیا۔ پھر بھی' پڑھائی میں دلچسپی نہیں تھی۔ جوں توں کر کے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی لیکن بی۔ اے کی چوٹی سر نہ کر سکے سر میں تو کچھ اور ہی سودا سمایا ہوا تھا کہ مطالعہ سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ بس ایک تلاش تھی صحیح سمت کی۔ بھابھی صاحبہ نے لگے ہاتھوں پھوپی صاحبہ کی نند سے میرے تعلق سے بات چھیڑ دی اور مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ یعنی انہوں نے زمین (دل) میں محبت کا ایک بیج بو دیا تو اس بیج کی جڑیں ان کی آنکھوں سے میرے دل میں اترنے لگیں۔ یہی ایسا جذبہ ہے محبت کا جو براہ راست آنکھوں سے دل میں اتر جاتا ہے یہی جذبہ ہر دو طرف دل میں اتر گیا تو دل سے دل بندھ گئے۔ وہ دن کیسے بھول سکتا ہوں' یکشنبہ ساڑھے پانچ بجے شب ۱۱ جون ۱۹۶۱ء م ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ جب میں نے خلوت میں انہیں اپنے کشادہ سینے سے چمٹا لیا تو وہ جیسے سینے میں سما گئیں تو لگا بہت پہلے کتاب کی اوٹ سے جو دیکھا تو وہ کیا تھا وہ کیا جذبہ تھا۔ کبھی سوچا بھی تھا جب ملے تو در پہ در کھلتے

گئے معلوم ہوا دل ایک محل ہے جس میں کئی در اور کئی کھڑکیاں کھلتی ہیں ورنہ دل پھولتا پچکتا گوشت کا ایک لوتھڑا ہی رہ جاتا جذبات سے عاری' ان کے یہاں جذبات کی کوئی کمی نہ تھی ہر طرح کے جذبات کی جو محبت کو دوام بخشتے ہیں جس میں کوئی پاگل پن کی حد تک چاہت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ دل کہتا ہے وہ نہ ملتے تو میں کچھ نہ تھا۔ وہ ملے ہیں تو بہت کچھ ہوں۔ اب نہیں ہیں تو میں کیا ہوں؟ میں ڈھارس دیتا ہوں تم یادوں کے ایک محل ہو، جس میں کئی در اور کئی کھڑکیاں کھلتی ہیں یادوں کی۔ سن سکو تو سنو وہاں کوئی بیٹھا یادوں کے سروں کو چھیڑ رہا ہے یہ کیا کچھ کم ہے کہ تم خالی نہیں ہو۔ اس میں اب بھی وہ ہے جس کو تم پسند کرتے ہو۔ جس کو تم نے کتاب کی اوٹ سے میری آنکھوں سے دیکھا ہے یاد ہے تم کو اے گردش ایام اب ذرا ٹھہر دم لینے دے بس اب پیچھے کی طرف چل...... میں اور وہ بیٹھے گیان چوسر کھیل رہے ہیں شادی سے سال دو سال پہلے کچھ عجیب سا کھیل ہے یہ بے شمار سانپوں کے پھن چھوٹے بڑے اوپر نیچے خانوں میں رہتے ہیں کہ کوئی (نرد) آئے تو نگل کر دم کے ذریعہ نیچے پھینک دیں۔ سانپوں کے علاوہ چھوٹی بڑی سیڑھیاں بھی رہتی ہیں جو کھیل میں پانسہ پھینکنے پر اُسی حساب سے ہر دو کی نردوں کو اوپر لے جاتی ہیں گر بیچ میں سانپ نہ نگلیں تو۔ ہر بار کھیل میں کبھی میں جاتا اوپر کبھی وہ لیکن ہر بار سانپ نگل کر نیچے پھینک دیتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ بغیر سانپ کے منہ میں آئے میں اوپر پہنچ گیا سیڑھیوں سے اور جنت میں داخل ہو گیا اور وہ مایوس ہو گئیں۔ وہ تو ایک کھیل تھا۔ حقیقی زندگی میں میرے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ چھڑا کر سیدھا جنت میں چلی گئیں اور میں دیکھتا رہ گیا سیڑھیوں پر ہی۔ کاش! میں اُس وقت جیتا نہ ہوتا ہار گیا ہوتا تو حقیقی زندگی میں شائد ایسا نہ ہوا ہوتا۔ یہ دل کہتا ہے جسم کارواں رواں کہتا ہے--- کون کہتا ہے کہ وہ اب مجھ میں نہیں۔ اب بھی ہیں مجھ میں اپنے نام کے ایک حصے کے ساتھ میرے نام کے حصے سے جڑے یعنی زہرہ مسحور۔ میں دماغ ہوں اور وہ دل ہیں۔ لکھتا ہوں تو ان کی یاد میں بولتا ہوں تو ان کی یاد میں کہ کاش!!

کوئی لوٹا دے میرے بیتے ہوئے وہ دن

میں یوں بھی اس طرح کہہ یا استعار اُبتلا سکتا ہوں کہ منزل غم کی رہگذر سے اس طرح اور یوں گذرا کہ ۔

اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے

۱۷/۲/۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

بہ سلسلہ خودنوشت سوانح سے :

ایک المیاتی نوٹ کہ ۲۶ رمارچ ۲۰۰۲ء ۱۱ رمحرم ۱۴۲۳ھ ہماری چھوٹی بھاوج جن کا ذکر خودنوشت میں آیا ہے بہ نام احمد النساء وہ گردوں کے عارضہ وامراض شش میں مبتلاء اویسی اسپتال میں منگل کی صبح (ساڑھے گیارہ بجے) دار فانی سے کوچ کر گئیں بھائی صاحب کو چھوڑ کر ہم سب کو چھوڑ کر تو لگا ہم نے' رشتوں کے ایک اہم خاندانی مرکز کو جو ہمارے بیچ ایک نیک فعال' خوشی و ہمدردی سے معمور و جود رہا ہے' کھودیا ہے۔ وہ ہماری ہم سب کی خوشیوں کبھی غموں سے بھی عبارت کیوں نہ رہی ہوں اپنے سارے وجود سے ایسے ہی تڑپ کا اظہار کیا کرتیں تھیں جیسے وہ ہمارے جسم کا ایک انگ بنی رہی ہیں' اب نہیں رہی ہیں تو دل مسوس اُٹھتا ہے۔ رشتے اسی طرح بنائے اور نبھائے جاتے ہیں۔ یہ ایسا ہی راستہ ہے جس میں خاندانوں کی خوشی' بہبودی واتحاد شامل ہے۔ آج کل کی بے راہ روی میں نہیں جس میں خاندانی رشتوں کی عزت و عظمت کو یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔ یادگار بطور مرحومہ کی ایک تصویر البم سے ملی ہے' دے رہا ہوں۔ تصویر اس شعر کے مطابق ہے' ہو بھی سکتی ہے چونکہ شعراء اکثر اپنے خیالات میں ہمہ گیر یکسانیت' انسانیت و جذباتیت لئے ہوئے ہوتے ہیں کہ ایسا اظہار خیال بسا اوقات دل کو چھولیتا ہے۔ المیاتی نوٹ کی طرح المیاتی یہ شعران ہی کی نذر کر رہا ہوں کہ انکا ''بھائی جان'' کہہ کر مجھ سے مخاطب ہونا اور سر جھکا کہ عزت سے سلام کرنا ہمیشہ یاد آتا رہے گا۔ شعران کی نذر ہے۔

میرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
نہیں ہے مرا کوئی نقش پا جو چراغ رہ گذر نہ ہو

(مجروح)

۲۷ رمارچ ۲۰۰۲ء

زہرہ مسرور

ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم

اظہارِ حقیقت

قصہ گوئی ہبوط آدم سے جاری ہے۔ اس کی صرف شکلیں بدلتی جائیں گی اور انسان اپنے احساسات دوسرے اذہان تک پہچانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ کوئی چیز حقیر نہیں، ہر حقیر سے حقیر چیز مسائل پیدا کرنے کا باعث ہوسکتی ہے۔

اس وقت دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ ایسی کروٹ جو اپنے اندر ایک آتش فشاں کو پھوٹنے کے لئے تیار ہے۔ ایک قلم کار جو کچھ دیکھتا ہے اور جس نظر اور زاویے سے دیکھا ہے وہی نظر اور زاویہ سے اس کو پیش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اور حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر کیوں نہ پیش کی جائے اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہوتی۔ نیم کے پتے کڑوے سہی خون ضرور صاف کرتے ہیں۔

شاعری میں نشتر زنی کی مثالیں تو بے شمار مل جاتی ہیں لیکن نثر (افسانہ) میں اس قسم کی مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ خدا نے زہرہ مسحور کو ایک نباض فطرت عطا کی ہے۔ وہ ہر تخلیق کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک ماہر طبیب اور ڈاکٹر کی طرح فاسد مادوں کی نشتر زنی پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ تخلیقی شہکار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ اس کی صلاحتیں جوالا مکھی کی طرح تحت الشعور میں ابلتی رہتی ہیں اور موقع ملتے ہیں پھوٹ پڑنے اور بہہ نکلنے میں کوئی دیر نہیں لگاتی۔ منزل کی تلاش میں نکلنے ولا راہی وقت گذراتے گزارتے خود رہنما بن کر اپنے راستے کا تعین کر لیتا ہے۔

تخلیقی ذہن ودیعیت خداوندی ہے کسی بھی تخلیق کا تعلق ذہنی عمل سے ہوتا ہے اور یہ ذہن عمل جب اپنا اظہار کرتا ہے تو اس سے تخلیق وجود میں آتی ہے۔

ایک اچھا قلمکار ابتداء ہی سے سماجی و معاشرتی برائیوں، کوتاہوں اور ناانصافیوں کے خلاف خود بخود آواز اُٹھاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کی تخلیقی صلاحیت ذہن میں وسعت پاتے پاتے، سماج کی آواز بن جاتی

ہے۔افسانہ نگاری بھی شاعری کی طرح تخلیق کے ہر پیچ و اسراری عمل سے گزرتی ہے اور موضوع کی صورت گری کرتی ہے جی ایس فریزر نے ناول کے بارے میں لکھا......

"ناول پہلے سے طئے کردہ خیالات کی ترتیب کا نام نہیں بلکہ زندگی کی رنگارنگی کی دریافت ہے"

اس لئے دریافت کا یہ عمل افسانہ کی تخلیق میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔افسانہ نگاری ادب کی ایک صنف ہے۔اور جس طرح ہر صنف ادب نے ترقی کی دور میں حصہ لیا ہے اسی طرح افسانہ بھی عصریت سے آشنا ہوتا رہا ہے اور اس سے روایت سے علامت تک کا سفر طے کرلیا ہے۔لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہی تخلیق مقبول اور زندہ رہتی ہے جس میں مقصدیت اور تعمیری ترسیلیت ہوتی ہے۔

زہرہ مسحور کے افسانوں میں روایتی مہک کے ساتھ عصریت اور سماجیت بھی نظر آتی ہے۔ان کے افسانوں کی نشتر زنی تعمیری ہوتی ہے۔افسانوں میں معنویت اپنی پوری جلوہ گری کرتی نظر آتی ہے۔انہوں نے اپنے بیدار شعور اور گہری حسیت کی بناء پر معاصر زندگی کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کو قلم بند کیا ہے۔ان کے افسانوں: سبق' آخرت' سرکاری لیٹرین' پولیس کی میخ' ایک نئی کہانی' تقسیم کا صرف تقسیم' گہرائی' اشرف علی نائی' چندہ' طلاق' پریم دیوانے' خلاء سوکھا' میں وہ تمام پہلو اجاگر نظر آتے ہیں جو سماجی اور معاشرتی نظم کی صورت گری کرتے ہیں انہوں نے نہ صرف اپنے افسانوں میں ہیئتی' لسانی اور تکنیکی لوازم کو برقرار رکھا بلکہ زندگی سماج اور فطرت کی مضمر حقیقتوں کو آئینہ دکھایا۔وہ سادہ اور فطری اسلوب سے افسانوں کو موثر بنا کر فطرت کی پردہ کشائی کرتے ہیں آزادی کے بعد افسانے نے کافی منزلیں طئے کرلیں بلکہ ایک عصری سائنسی عہد کا آغاز بھی کردیا چنانچہ ادب کا تجزیہ نفسیات' معاشیات اور سماجیات کی طرح خالصتاً سائنسی بھی ہونے لگا۔اس عصری ذہنی رویے نے اردو افسانے کے زوائے بدل کرر کھ دئے نئے معیار اور اصول مرتب ہوئے۔غیر مکمل ادب اور مغربی علم وفن کے معیار و مطالعے نے تحقیقی و اقتصادی' شعور و ادراک کو نہ صرف جلا بخشی بلکہ طرز بیان اور اسالیب کی تازگی اور شگفتگی اور جدید طرز اظہار نے ادب شعری افسانے تحقیق و تنقید کو قدیم روایتی ریاضی کے فارمولائی فارم سے نکال کر سلاست روانی اور صفائی سکھائی' ذہن کے دریچے وا ہوئے' جہاں تحفظ ذہنی کا خاتمہ ہوا کیونکہ اپنی ذات کے بارے میں جان لینا اپنے آپ کو پہچان لینا ہی سب سے بڑا علم ہے کسی بھی علم اور فن کو حاصل کرنے کے لئے شعور و محنت درکار ہوتی ہے اور جن لوگوں نے یہ علم حاصل کیا اور نہ فن وہ صرف نام کے انسان ہیں۔فنکار فطرت کا عاشق ہوتا ہے اسلئے وہ اس کا غلام بھی عاشق بھی اور مالک بھی انسان کے گوں ناگوں جذبات کا تند دھارا جب روکے نہیں رکتا تب فن کی شکل اختیار کرلیتا ہے کیونکہ فن قدرت کا فن پارہ ہے فن خدا کا پرتو ہے اور ذہنی یکسوئی انسانی فتح کی طاقت ہے۔خوشی صرف فتح ہی سے

نہیں بلکہ فتح کیلئے جدوجہد کرنے اور مصائب برداشت کرنے میں حاصل ہوتی ہے انسان کا انسان ہونا ہی اس کی اصل فتح ہے۔ کردار انسان کے اندر رہتا ہے نیک نامی اس کے باہر' فرضی جذبہ سے اونچا ہوتا ہے اور ایک کہانی کار کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ذات کے بارے میں خود جان لے۔

زہرہ مسحور افق ادب پر نئی آب و تاب کے ہمراہ نمودار ہوئے ہیں ان کی ہمہ جہت صفات شخصیت ویسے بھی تعارف کی محتاج نہیں۔ نثر افسانوی ادب کے ساتھ نثری شاعری میں انہیں دسترس حاصل ہے۔

نثری نظم ''لمحے یادوں کے'' خود ان کی آپ بیتی ہے بڑی ہی دردناک و مؤثر' تلنگانہ مووَمنٹ Movement پر نظم ''مت بھولو کہ یہ حقیقت ہے'' الفاظ کے پیراہن میں حقیقت کو چھپاتی نہیں بلکہ دیکھلاتی ہے کہ ''خوشی خوشی اپنے زیر جامہ اوپر اُٹھائے تم آئے تھے'' یا وہ نظم قانون 498-A کے تحت بولا جاتا ہے ''چھوڑ دو لڑکی کو' یا ساتھ چل کر رہو لڑکی کے'' میرے بوڑھے بیمار ماں باپ کس کے سہارے'' لڑکے کی دھیمی سی یہ آواز بھی تمام خاندان پر کیسے بجلی بن کر آشیانوں پر گرتی ہے نظم میں 498-A کا کچا چٹھا ہے اور آخری نظم ''روشنی کا سفر'' پڑھتے پڑھتے جیسے وقت ٹھہر جاتا ہے کہ ''روشنی کا یہ سفر'' ایک سہانا سفر بھی ہے جورات کی کوکھ سے پھر دن کو نکالتا ہے۔

''یادوں کے جھروکے'' نیا افسانوی طرز لئے زہرہ مسحور کا دوسرا افسانوی مجموعہ' نثری شاعری کے علاوہ سیاسی جھرکوں سے سوچ بچار کے راستے نکالتا پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ زہرہ مسحور انتہائی قابل اصول پسند' باکردار با حوصلہ' محنتی اور فعال ہمہ مقصدی و ہمہ جہت قلم کار ہیں ہر موضوع پر اور خاص طور پر سماجی اور معاشری موضوع پر بے لگان لکھتے ہیں۔ آج کے مشینی دور میں مختصر افسانہ نگاری کو سند پسندیدگی حاصل ہے سعادت حسن منٹو نے جو چراغ روشن کیا تھا اس کی لو کو تیز تر کرنے والوں میں زہرہ مسحور کا نام بھی شامل ہے۔ ایسا نہیں کہ انہوں نے مختصر افسانے ہی لکھے بلکہ بعض طویل افسانے بھی ہیں لیکن طویل افسانوں کے مقابل ان کے فن کو قوس قزح مختصر افسانوں میں زیادہ آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں اور ان کے فن کا کینوس مختصر افسانوں میں انتہائی وسیع ہو جاتا ہے ان کے فن میں رومان کے ساتھ گہرا اور کاری طنز بھی ہوتا ہے۔ زندگی کے سچے واقعات تلخ حقائق اور روزمرہ کے مسائل کی رونمائی کوئی ان سے سیکھے۔ زہرہ مسحور نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے پرکھا ہے برتا ہے اور اس میں اپنے فن کی رنگ آمیزی بھی کی ہے اپنے شدید احساسات مشاہدات اور گہرے تجربات سے بھرپور استفادہ ہی نہیں بلکہ پوری ایمانداری اور جانبداری کے ساتھ اسے آئینہ دیکھلایا ہے۔ زہرہ مسحور کے افسانوں میں درد کرب' حرماں ویاس غربت' افلاس غلامی'

جہالت‘ طبقاتی کشمکش‘ بیکاری‘ پریشانی‘ سماجی نابرابری اور معاشرتی بے راہ روی بھی ملتی ہے ان کے افسانوں میں شاہین کے مظالم سیاسی سماجی بے راہ روی معاشی واقتصادی بدحالی اوراس دور کی جہالت پراگندگی بھوک افلاس برہنگی‘ ظلم وستم جبروزور ظالم ومظلوم کے جذبات کی پوری جرأت کے ساتھ عکاسی ہوتی ہے۔ زہرہ مسحور نے اپنے افسانوں میں جہاں واردات قلبی اور نفسیات کا تحلیل تجزیہ خلاقانہ طور پر پیش کیا ہے۔ خاص کر ان کے افسانے درندے‘ مجرم‘ پولس کانسٹبلری‘ ہونی انہونی‘ نفسیاتی معالج‘ یہ حادثہ کیسا ہے‘ پارٹیشن‘ جیئے وجیئے‘ معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں پر ان کی نشتر زنی اور کامیاب جراحت اور فرسودہ سماجی رسم و رواج پڑھنے کے لائق ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کے یہ افسانے عوام وخواص دونوں میں اور خاص طور پر علمی وادبی حلقوں میں شوق سے پڑھے جائیں گے اور اس کی پذیرائی ہوگی۔

اس کے ساتھ ان کی نثری شاعری میں ’’مسلمان ومساوات‘‘ وہ کوئی اور نہیں ’’واقعات کا بھرپور احاطہ کرتی ہیں جس میں زندگی کی تلخیاں‘ پرچھائیاں رسوائیاں ہیں‘ قابل قدر نگاہ سے دیکھے جائیں گی۔ آخر میں اتنا ہی کہوں گا کہ --- ان تحریروں میں شعلہ کی گری اور شبنم کی نمی صندل کی مہک اور شہد کی مٹھاس کے ساتھ اورسنکھیا کا اثر بھی ہے۔ کیونکہ تخلیق کار کو اپنی ہر تحریر سے پیار ہوتا ہے اسی لئے ان کی تمام تحریروں کو جو کہ دل کے نہاں خانوں سے نکلی ہیں ہم کو پذیرائی کرنا ہوگا۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

مورخہ: ۹/مارچ ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر۔م۔ق سلیم

سائبان 469-2-19 بیرون فتح درواز‘ حیدرآباد

Ph: 4562437

یہ سچ ہے کہ میں کوئی محقق یا تنقید نگار ہوں اور نہ ہی ہو سکتا ہوں۔ میں تو بس ایک کہانی کار ہوں اپنے قول میں بند ایک سانچے موتی کی طرح۔ کہانیوں میں ہر جگہ موجود ہوں وہ اور میں' کرداروں میں شامل اشاروں اشاروں میں پردوں کے پیچھے سے 'بول ہم رہے ہوتے ہیں لیکن لگتا ہے، وہ بول رہے ہیں۔ کٹھ پتلی کے سے اس کھیل میں جو شطرنج کی طرح لگتا ہے شہہ ہم دیتے ہیں جیت ان کی ہوتی ہے۔ اس طرح ایک کہانی کی تخلیق ہو جاتی ہے---- جس طرح ایک بچے کی تخلیق میں مادری کوکھ کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح تمثیلاً تخلیقی نقطہ نظر سے ادبی تخلیق میں بھی ذہنی کوکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا ذہنی کوکھ میری بیوی زہرہ تھیں اور ہیں۔ اگرچہ آج وہ میرے درمیان نہیں لیکن ہیں۔ دراصل تخلیقی عمل کو جاری وساری رکھنے ہمارا ملاپ ناموں سے یکجا ہو گیا ہے جو تخلیقی عمل میں میرے ساتھ ہیں کہیں کہیں وہ نظر بھی آجاتی ہیں' تخلیقی عمل کی طرح دوڑ میں شامل معلوم نہیں ہوتا کہ میں ان کی پیچھے ہوں یا وہ میرے پیچھے۔ لیکن بار آور ہو جاتے ہیں ہم ذہنی کوکھ میں ایک تخلیق کے ساتھ کتنی عجیب بات ہے یہ......

یہ کہانیوں کا مجموعہ ''یادوں کے جھروکے'' ان ہی کے نام منسوب ہے بطور عقیدت اور نظم بھی ''لمحے یادوں کے'' الفاظ کے پیراہن میں تصور سے تصویر میں ڈھلے یادوں کو دہراتے آج بھی ذہن میں اور فضاء میں معطر ہیں رچی بسی ایک خوشبو کی طرح۔

یہ بھی سچ ہے کہ میں ساحر کی طرح محبت کے بڑے سے بڑے یا چھوٹے سے چھوٹے جذبہ کو کسی بھی اساس پر نہیں پرکھتا۔ چاہے وہ غربت کا ہی کیوں نہ ہو بلکہ محبت کی ایسی نشانی کو جس کو ساحر نے موضوع بنایا تھا بطور ''تاج'' ایک یادگار سمجھتا ہوں۔ میرے لئے محبت کا ایسا جذبہ عمارت میں تو نہیں' ہاں! کچھ یادگار لمحے ہیں نثری عبارتوں میں شامل جو کئی طرح کے جذبوں کو نکتہ' عروج پر لے جاتے، لے جاتے تخلیقی عمل میں کبھی خوشی کبھی غمی اور درد کا احساس دلا دیتے ہیں اور حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ تاریخی عمارتوں کو دیکھنے پر ہوتا ہے یا پھر نثری بھول بھلیوں میں جو تاج کی سی لافانی محبت، کو بطور خراج جلاء بخشتے

ہیں۔ کم وبیش محبت کی ایک نشانی بطور کہیں بھی۔ ایک شعر ہے محبت پر ہی ممکن ہے یہ تاج کی عظمت کی مرمریں اساس کو شاہ جہاں کے تئیں دوام بخشے۔

تیری صورت نگاہوں میں پھرتی رہے
عشق تیرا ستائے تو میں کیا کروں

''میں کروں'' کا سا اندازِ گفتار ہی ہر لمحہ جدائی کے کرب کے احساس کو بڑھا کر کچھ کر دیکھانے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے تب ہی جذبہ' عشق بھی ''ممتاز'' کی یاد کی طرح ایک یادگار لمحے کو ''تاج محل'' جیسی خوبصورت عمارت جو آنسو کی طرح ڈھل کر زمین پر اور تاریخ میں صفحہ' قرطاس پر منقش ہو گئی' ہے یاد دلاتا رہتا ہے۔ میری حد تک بس اتنا ہی ہوا ہے' آگے اللہ ہی اللہ ہے۔

ان دنوں جب کہ شریک حیات کی جدائی کا احساس ہر دم تازہ رہتا ہے' یونہی اکثر بے یار و مددگار گھر پر ہی پڑا رہتا ہوں صرف پڑھنا لکھنا' کھانا پینا (صرف پانی) مشغلہ ہو تو کتاب کی طباعت کے مراحل کیسے طئے ہوں۔ میرے مکتوب پر جو حیدر آباد کے ایک مشہور اخبار ''منصف'' میں مشتہر ہوا لوگ ملتے گئے اور کارواں بڑھتا گیا۔ کتاب کی اشاعت میں۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ فون ایک سہولت کی چیز ہے چراغ جن کی طرح بس چراغ رگڑا گھنٹی بجی اور جن حاضر حکم پہنچانے۔ تاہم میرے برادر خورد محمد مسعود احمد جو حسن سلوک و انتظامی امور میں ماہر ہیں اس کتاب کے جملہ حقوق کی جس طرح ذمہ داری اُٹھائی ہے وہ ایک کارنمایاں ہے۔ کتاب کی کمپوزنگ و طباعت سے لے کر گٹ اپ تک اور آگے اور بھی مراحل ہیں بمصداق ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

قارئین سے التماس ہے کہ ماسوا ان کہانیوں کے کوئی بھی کہانی میری دستیاب ہو تو ایک گمشدہ تحریر سمجھ کر بھجوانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

خیراندیش
زہرہ مسرور
20-3-912 Shah Ghaj, Jubilee post
Hyderabad. (A.P.) 500002
Ph : 4415713

۲۷ر ستمبر ۲۰۰۱ء

عالم ارواح پر کئی طرح کے واقعات سے دنیا کی ہر زبان کا ادب روشناس ہے۔ انگریزی ادب کچھ زیادہ ہی' بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ سرفہرست ہے۔ میں نے نفسیاتی الجھن اور روح کی آمیزش سے ایک کہانی' دہشتناک واقعات وآپسی جنگ سے متعلق لکھی ہے جس کا انجام ایک ایسی جنگ ہے جو ایٹمی ہتھیاروں راکٹوں پر مشتمل ہوگی یعنی آئے دن کے دخل اندازی سرحدوں پر ہر دو طرفہ ٹھیک نہیں۔ اس سے سویلین بھی متاثر ہوں گے شہر بھی۔ دنیا کی ضرورت راکٹوں' مزائلز کی نہیں' امن کے پرندے کی ہے جو چونچ میں اناج کی گیت ایک بالی دبائے آکاش کی بے پناہ وسعتوں میں انسان کی پہلی ضرورت کی علامت کے طور پر نگہداشت کر رہا ہے۔ کاش ہم اُس کی سمجھ' علامت اور نگہداشت کا درس لیتے۔ یہی اس کہانی کا بیگ گراؤنڈ ہے۔ اور عنوان ہے۔ ''ہونی انہونی''

سائمن نہ صرف سیکس اسپیشلسٹ تھی بلکہ نفسیات کی ماہر بھی۔ اُس کی کلینک کے باہر مختصر سے ورانڈے میں جیسا کہ زنانی ومردانی جنسی اعضاء کے تشریحی چارٹ دیگر کلینکوں میں دیواروں پر ٹنگے دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ یہاں دیوار پر ٹنگے سیاہ بورڈ پر سفید جلی حرفوں میں جو تحریر پڑھنے کو ملتی وہ تھی۔

''دنیا میں پچانوے فی صد مرد نامرد نہیں رہتے بلکہ نامردی کا خوف ہی انہیں نامرد بنائے رکھتا ہے''۔

چنانچہ مس سائمن جو نہایت خوبصورت' غیر شادی شدہ' ان معنوں میں کہ اس کا ایک عدد قانونی شوہر نہیں تھا' مناسب خدوخال چھریرے بدن کی' جس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی' ہر کسی پر یہی کارگر نسخہ آزما کر اپنی کوششوں سے اُن کے ساتھ تعاون کر کے انہیں زندگی کی ایسی خوشیوں سے ہمکنار کر دیتی تھی جس کے لئے وہ دنیا کی تمام خوشیوں سے زیادہ اس کے طلب گار رہتے۔

اُس کا یہ کلینک شہر سے دور مضافات میں گھنی جھاڑیوں اور نیم کے ٹھنڈے پیڑوں کی چھاؤں تلے جہاں دور دور تک مکانات کا نام ونشان تک نہیں آباد تھا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اُس کا کلینک ریگستان میں ایک نخلستان کی طرح تھا۔

یہاں زیادہ تر وہی مریض آیا کرتے جو خوشگوار ازدواجی زندگی گذارنے کے خواہشمند تو ہوتے لیکن کچھ ذہنی' مقامی یا اندرونی رکاوٹیں از خود ان میں ایسی پیدا ہو جاتیں کہ انہیں اپنی زندگی ہی اجیران لگتی۔

عموماً سائمن کا کلینک شام کے اوقات میں ہی کھلا رہتا۔ اور مریضوں کے دستیاب نہ ہونے پر گھنٹہ دو گھنٹہ بعد بند بھی ہو جاتا۔

ایک شام مس سائمن مریضوں کے انتظار میں کلینک کھولے سفید ساڑی و بلاوز میں ملبوس سیاہ تراشیدہ بالوں میں ایک گلاب کا پھول اڑسے گڑیا کی طرح ٹیبل کے سامنے بیٹھی انگلش میگزین ''دی لائف'' کی ورق گردانی میں مصروف تھی کہ کلینک کا خودکار دروازہ آہستہ سے چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ سائمن نے بڑے اشتیاق سے اُدھر نظر دوڑائی اپنی گھنی، شوخ پر تجسس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور میگزین کو ٹیبل پر رکھ دیا۔

اُس کے سامنے بڑی شان سے چلتا ہوا ایک فوجی خاکی وردی میں ملبوس سینے پر سجے تمغوں کی نوعیت سے وہ ایک آفیسر لگ رہا تھا۔ آ کھڑا ہوا تھا۔

وردی کی سائیڈ میں ایک چھوٹا سا پستول ہولسٹر میں اڑسا ہوا تھا اور سر پر فیلٹ جمی ہوئی۔ وہ خاصہ اُونچا پورا گٹھیلے بدن کا تھا۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ بس یہی ایک چیز اُس کے چہرے کو رعب دار بنائے ہوئے تھی ورنہ اُس کے چہرے پر اتنی ملاحت تھی جتنی کہ عورتوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔

سائمن اُس کے چہرے کے خدوخال اور مونچھوں کی طرف دیکھتے ہی جو اس کی وردی کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ مسکرا دی۔

''فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔'' وہ بولی پھر جلد ہی اُسے اپنے سوال کے بے ہودہ پن کا احساس ہوا تو یوں گویا ہوئی' میرا مطلب ہے بیٹھئے پھر آنے کی غرض و غایت یعنی آپ کو کیا شکایت ہے بولئے۔''

''میں آپ سے ایک نجی بات کرنا چاہتا ہوں ڈاکٹر! یہاں اور کوئی تو نہیں'' فوجی جو آفسر ہی تھا اُس کے سامنے جہاں دو چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں ایک کرسی کھینچ کر اُس پر بیٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا......

''آپ شوق سے بلا کھٹکے کہہ سکتے ہیں کوئی بھی بات۔'' وہ دلبرانہ انداز سے مسکرا دی......

''اس وقت یہاں کوئی بھی نہیں''۔ پھر وہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی......

تھوڑی دیر تک فوجی جو آفیسر تھا ہچکچاتا رہا بولنے سے جیسے وہ اپنے ذہن میں چھپی گتھی کو بولنے کی اپنے میں ہمت نہ کر پا رہا ہو۔ جیسے گھبراہٹ اور شرمندگی نے اُسے جکڑ رکھا ہو۔ تاہم ٹیبل پر پڑے پیپر ویٹ کو گھماتے نیچی نظریں کیے ہوئے اپنے حواس کو مجتمع کرتے آہستہ آہستہ کچھ یاد کر کے بولا۔

''ڈاکٹر! ابھی ابھی یہاں آنے سے پہلے باہر ورانڈے میں، میں نے بورڈ پر ایک چونکا دینے والی تحریر پڑھی ہے پہلے آپ یہ بتلائیں کہ آیا یہ کسی فلسفی کے خیالات ہیں یا آپ کا ذاتی تجربہ''

سائمن نے کچھ دیر آنکھیں بند رکھنے کے بعد انہیں کھولا۔ ''سچ تو یہ ہے مسٹر!'' وہ بولی ''یہاں جو بھی آیا کبھی کسی نے اس تعلق سے کچھ نہ پوچھا۔ آپ پوچھ رہے ہیں تو لگتا ہے اس کی صداقت کے آپ نہ صرف معترف ہیں بلکہ معتقد بھی''۔

''ہاں۔!'' اس نے ہنستے ہوئے اپنا سر ہلایا ''کسی حد تک میڈم! لیکن آپ کو اس کی صراحت کرنی ہوگی''

''خیر چھوڑیئے اس کو آپ خود ہی سمجھ جائیں گے پہلے آپ یہ بتلائیں کہ آپ کو کیا شکایت ہے۔'' سائمن نے مطلب کی طرف آتے ہوئے کہا۔

مطلب کی بات پر فوجی جو آفیسر تھا گڑ بڑا گیا۔ پھر بات کا رُخ موڑتے ہوئے وہ عالم ارواح پر اُتر آیا۔ جس کا مطلب تھا ''کیا آپ عالمِ ارواح پر یقین رکھتی ہیں''۔

اس غیر متوقع سوال پر سائمن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں آپ کا مطلب نہ سمجھ پائی مسٹر یعنی کہ آپ''۔

''میں مسٹر الف خان۔ لیفٹیننٹ کمانڈر الف خان'' فوجی نے بتلایا ''تو مسٹر الف خان' لیفٹیننٹ کمانڈر' آپ کھل کر بولئے نہ اپنی بات کہ آخر آپ کا مطلب کیا ہے عالم ارواح سے''۔

''میرا مطلب ہے عالمِ ارواح سے بلکہ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں اس بارے میں کہ کوئی مرنے کے بعد بھی وہی صورت' وہی لباس اور وہی حالات میں بار بار سامنے آ کھڑا ہو تو آپ اسے کیا کہیں گی''۔

سائمن دوبارہ چونک گئی۔ دوسرے ہی لمحہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بولی دیکھئے اس کو ہم ایک نفسیاتی مرض کہیں گے اور کچھ نہیں۔''

''بے شک آپ اسے اوروں کی طرح نفسیاتی مرض ہی کہیں' لیکن میں نہیں کہوں گا۔ اسے ایک روح کی قوت جو مجسم لگتے ہوئے بھی نہیں رہتی۔ بس وہ ایک ہوا کا جھونکا رہتی ہے۔ دیکھتی بھی انہی کو ہے جو اس سے متعلق رہتے ہیں۔ دوسروں کو نہیں''۔

سائمن ہنس پڑی ''مطلب یہی ہوا کہ مرنے کے بعد کوئی بار بار آپ کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ خیر ایسا ہوتا ہوگا آپ کہہ رہے ہیں تو لیکن کس وقت اور کن حالات میں اس کیلئے بولنے سے پہلے آپ آرام سے لیٹ جائیں اُس بستر پر''۔

اُس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے ٹیبل پر بچھے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''پھر آپ بولتے رہیں میں سنتی رہوں گی ہو سکتا ہے درمیان میں کچھ پوچھ لوں یا ہدایت دوں۔ ایسے نفسیاتی کیسوں میں یہی میرا طریقۂ علاج ہے''۔

الف خان نے ذرا ہچکچاہٹ کے بعد ٹیبل کے قریب جا کر پہلے اپنا ریوالور کھول کر سرہانے رکھ دیا پھر اپنی فیلٹ اور ڈریس اُتار کر ٹیبل پر لیٹ گیا' جس پر بے داغ سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کے عین سر کے اُوپر نظروں کے سامنے ایک دھیما بلب جو ایک کینڈل قوت کی روشنی پھینک رہا تھا' وہ اس پر نظریں جمائے آہستہ آہستہ اپنے بکھرے خیالات کو ٹٹول رہا تھا۔ سرہانے سائمن آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سفید بلوز' ساڑی میں سر کو سفید کپڑے سے ڈھکے ایک فرشتہ کی طرح لگ رہی تھی' جو اس کے اعمال کا حساب لے رہی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ماحول اتنا خوابناک ہو گیا تھا کہ سائمن کے ہلتے ہوئے لب جس میں جانے وہ کیا کہہ رہی تھی' اُسے ایک لوری کی طرح تھپکیاں دیتے ہوئے سلانے لگے نیم وا آنکھوں سے جو بوجھل ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ الف خان دیکھ رہا تھا اپنی پچھلی زندگی......

وہ اور اُس کے ساتھی سرحد کی نگرانی کرتے ہوئے عیش کر رہے تھے وہ سب شراب کے نشہ میں دھت لڑکھڑا رہے تھے پھر اسی عالم میں اُن میں سے چند جیالے جس میں الف خان بھی شامل تھا سرحد کے اندر تک گھس گئے تھے وہاں دشمن حالت برہنگی میں برہنہ لڑکیوں سے دادِ عیش دے رہے تھے۔ تب الف خان اور اس کے ساتھیوں نے اُن پر شب خون مارا تھا' اس طرح کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو عالم برہنگی میں معہ اسلحہ کے اپنے کندھوں پر اُٹھا لائے تھے۔ پھر سرحد پر ہی خاردار تاروں' خشک جھاڑیوں' سنگلاخ چٹانوں اور ریتیلے میدانوں میں ہی اِدھر اُدھر بکھرے دادِ عیش دینے لگے...... الف خان کو یہ نظارہ کھلے عام پسند نہ آیا تھا' وہ اسے کندھے پر ڈالے محفوظ جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ اُسے دور ایک نخلستان نظر آیا۔ وہ اُدھر کندھے پر لڑکی کو سنبھالے دوڑا......

سرہانے جلتا ہوا زیرو بلب اب الف خان کو ہزار کینڈل کا لگ رہا تھا...... اس تیز روشنی میں وہ دیکھ رہا تھا وہی نظارہ...... جھٹ اس نے اپنا پینٹ اُتار کر ایک طرف رکھ دیا ہے پھر جانگیہ کھول کر اپنے دونوں پیروں کو گھٹنوں میں سے موڑے خشک چٹانی زمین پر ٹکائے لڑکی کے اوپر جُھک پڑا ہے جس کو اس نے چت لٹا دیا تھا۔ وہیں جھاڑیوں کی آڑ میں اور اُس کے ساتھ جنسی اختلاط کرتے ہوئے اُسے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے' جیسے وہ جگہ وہ نہیں بلکہ ایک خشک کنواں ہے جس کا پانی تل تک کھینچ لیا گیا ہے۔

سائمن جو اس کے سرہانے دم سادھے کھڑی یہ سب سُن رہی تھی۔ یکدم چونک اُٹھی اُس نے دیکھا یکلخت وہ کیسے بدل گیا تھا۔ لیٹے لیٹے اُس کی حالت یکدم غیر ہو گئی تھی ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ انہی کپکپاتے ہاتھوں سے پہلے اُس نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا پھر منہ کھولا تو سائمن کو لگا یہ اُس کی آواز نہیں بلکہ کسی اور کی ہے۔ وہ ایک عجیب و غریب کہانی سنا رہا تھا...... وہ کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکی جو اس کے حصہ میں آئی تھی اس

کے ساتھ اختلاط کرنے لگا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ وہ لڑکی نہیں لڑکی کی لاش ہے۔ اور اُس وقت سے ہی ''وہ'' ہر لڑکی کے ساتھ اختلاط کے وقت اُس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

سائمن دم بخود حیرت سے منہ کھولے کھڑی رہی۔ عالمِ ارواح اٹل تھا۔ ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ الف خان کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ سچ بول رہا ہے اور اس کا یہ تصور ہی سائمن کے لئے سوہانِ روح سے کم نہ تھا جو الف خان کے ساتھ کمرہ میں اکیلی تھی۔

سائمن کے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اچانک اُسے لگا ٹیبل پر الف خان نہیں الف خان کی لاش پڑی ہے۔ اور اس کے سامنے وہ خود نہیں بلکہ وہی لڑکی کی لاش ہے۔ اس عجیب وغریب خیال کے آتے ہی وہ کانپ گئی غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکا'' کیا واقعی وہ لاش تھی''۔

''نہیں وہ لاش نہیں تھی'' سائمن کو ٹھیک اپنے کانوں کے پیچھے اندھیرے گوشہ سے ایک تیز سرگوشی سناٹے کو چیرتی ہوئی گھسی' لگا وہ اُس کے کانوں کے پردوں کو بھی پھاڑ دے گی۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ تبھی اُس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی۔

اُس کو اپنے پیچھے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس گن اٹھائے دہشت گردوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔

الف خان نے جو خوابیدہ حالت سے جاگ اُٹھا تھا۔ گھبرا کر اپنے سرہانے سے پستول اُٹھا لیا کہ فائیر کردے۔

''ایسی غلطی نہ کرنا بے وقوف'' تبھی ایک دہشت گرد الف خان کی طرف گن اُٹھائے زور سے دھاڑا اور بڑھ کر سائمن کو اپنی بانہوں میں مضبوطی سے جکڑ لیا۔

سائمن نیم جاں ایک پرندہ کی طرح اُس کی بانہوں میں پھڑ پھڑانے لگی...... اس کوشش میں اس کے سر کا اسکارف کھل کر دور جا پڑا تھا۔ بال بکھر گئے تھے اور اُس میں اڑسا پھول پیروں تلے مسلا جا چکا تھا۔...... پھر وہ سب سائمن کو ڈھال بنائے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے......

''کیوں بے وقوف کیا شب خون سرحد پر ہی ہوتا ہے' شہر میں نہیں'' کہتے ہوئے اُس نے' جس نے سائمن کو دبوچ رکھا تھا' زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ ساتھ ہی وہ سب اپنے پیچھے خودکار دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے سائمن کو اُٹھائے ہوا ہو گئے۔

الف خان نے جھلا کر خودکار دروازہ پر جو بند ہو چکا تھا ایک فائر جھونک دیا'' خدا تم کو غارت کرے''۔ اس کے منہ سے نکلا۔ ''خدا کرے تمہاری بھی حالت میرے جیسی ہو جائے''۔ پھر جھلاتے ہوئے اُس نے ریوالور کو اپنے سے دور پھینک دیا۔ اور کمر پر ہاتھ رکھے ٹیبل پر ہی دوہرا ہو گیا۔

باہر تند ہواؤں کے جھکڑوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ کسی طرح اس منحوس کلینک کے خودکار دروازہ سے باہر نکلا۔ اب وہ یہاں ایک منٹ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ باہر چاروں طرف ریت کے ذرے اُڑتے پھر رہے تھے۔

ورانڈے میں دیوار پر ٹنگا بورڈ ایک جھٹکے سے ہوا کے زور پر کیلوں سمیت اُکھڑ گیا تھا اور ایک زوردار آواز سے دور فرش پر جا گرا۔ کئی درخت جڑ سمیت اُکھڑ گئے۔ اطراف اکناف کئی جھونپڑیوں کے چھپر اُکھڑ گئے۔

لمحہ بہ لمحہ ہواؤں کا زور بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ الف خان کلینک سے باہر پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہا تھا خود کو سنبھالے کہ۔ ہوا کا دوسرا جھونکا اتنی شدید نوعیت کا تھا کہ اُس کے پیر زمین سے اُکھڑ گئے۔ اور وہ ایک تنکے کی طرح زمین سے اُوپر اُٹھا اور ہوا میں تیرتا ہوا بل کھاتا' فضاء میں دور ہوتا ہوا ایک راکٹ کی طرح گم ہوگیا۔ اُس کے پیچھے ریت کے ذرے بڑی مقدار میں دھویں کی لکیر کی طرح اُڑتے چلے گئے۔

دوسری صبح ریتیلے طوفان کے تھمنے تک' جہاں سائمن کا کلینک تھا' وہاں ریت کا ایک بڑا ٹیلہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔

❀❀

یہ حادثہ کیسا ہے؟

پلین کے اکثر حادثات کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حال میں نیویارک وواشنگٹن شہروں میں ہوا۔ جیسا کہ اس وایودوت طیارے میں ہوا۔ جب حادثوں میں طیاروں کے اکثر بلیک باکس ہی دستیاب نہ ہوں تو شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ حتمی طور پر کچھ کہا نہ جاسکے تو انصاف کے تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے اور نزلہ کسی پر گرے ناواجبی ہوتا ہے اس سے بچنا چاہیئے---

۲۳/ستمبر ایک وایودوت طیارہ ڈوریز (بی۔۲۲) پونے ایرپورٹ سے سات بج کر اٹھائیس منٹ پر روانہ ہوا اور اپنی پرواز کے نصف گھنٹے کے اندر ہی حالات پرواز میں دھماکہ سے تباہ ہو کر بھیما ندی پر بنائے گئے اوجانی ڈیم میں آٹھ مسافرین اور تین ارکان عملہ سمیت گر پڑا۔ اس میں موجود تمام ہی گیارہ افراد ہلاک ہو گئے۔

یہ پہلی خبر تھی جو میں نے صبح صبح اخبار کے پہلے صفحے پر جلی حرفوں میں پڑھی تھی۔ تو مجھے افسوس ہوا تھا کہ جانے آج کل طیاروں کو کیا ہو گیا ہے کہ آئے دن اخباروں میں ایسی اطلاعیں آتی رہتی ہیں۔ پھر میں نے اُن گیارہ افراد کے ناموں پر جو ہلاک ہو گئے تھے نظر دوڑائی تو چونک اٹھا۔ ان میں ایک نام میرے لئے نیا نہیں تھا کیونکہ اس نام کے ساتھ عہدہ بھی درج تھا۔ آر۔ ڈی۔ او اور نام مسٹر پدمیا۔

مسٹر پدمیا کے تعلق سے تفصیلی خبر آگے کچھ اس طرح تھی کہ انہیں ایک رکن اسمبلی کی اہانت کرنے کی پاداش میں اسپیکر اسمبلی نے دو دن کی قید سادہ کی سزا سنائی تھی۔ ان کے خاندان کے ذرائع نے بتلایا کہ پدمیا وارنٹ کے خلاف سپریم کورٹ سے حکم التواء حاصل کرنے کے بعد سائی بابا مندر کی یاترا کے لئے شری ڈی۔ گئے ہوئے تھے اور اس بدنصیب طیارہ سے واپس ہو رہے تھے کہ حادثہ کا شکار ہو گئے۔

مسٹر پدمیا کو میں اُس زمانہ سے جانتا ہوں جب میری پوسٹنگ کلکٹر آفس میں ہوئی تھی بہ حیثیت ایک اہلکار کے وہاں وہ یو۔ ڈی۔ سی تھے اور سیکشن لینڈ ایکویزیشن ڈیل کر رہے تھے۔ وہ بے حد خوش مزاج اور اپنے کام سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن مزاج کے ذرا تیز کہ کوئی خبر غلط اپنے بارے میں سننا کبھی گوارا نہیں

کرتے تھے۔ اور دباؤ کے تحت کام کرنے کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ کسی کو ستانا چاہتے تھے بلکہ وہ ہر کام کو باریک بینی سے دیکھ کر ہی آگے قدم اٹھانے کے عادی تھے۔ کوئی اس بارے میں جلدی کرتا تو وہ اس کو فوراً جھڑک دیتے تھے۔

میرا خیال ہے رکن اسمبلی کی اہانت کرنا ان کا مقصد نہ رہا ہوگا۔ لیکن آج کل بعض رکن اسمبلی جن کا تعلق برسر اقتدار پارٹی سے رہتا ہے اکثر وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ اس مراعت کمیٹی کا بھرپور فائدہ اٹھایا جائے جو ان کے ہاتھوں میں حکم کے یکے کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ برسر اقتدار پارٹی کے ایک مقامی ایم ایل اے نے اپنے ایک حامی کے خلاف کارروائی کرنے پر پدمیا کو سنگین نتائج و عواقب' بشمول جھوٹے مقدمے اور مار پیٹ کی دھمکی دی تھی۔ اس کے بعد مسٹر پدمیا نے ایک مقامی پولیس اسٹیشن میں ایک شکایت پیش کی۔ انہوں نے ضلع کلکٹر کے پاس بھی شکایت پیش کی ان دونوں میں کئی بار جھڑپیں بھی ہوئیں بعد میں ایم۔ ایل۔ اے۔ نے الزام لگایا کہ مسٹر پدمیا اپنے ڈویژن میں فیر پرائس شاپ ڈیلرز کا تقرر کرتے ہوئے بدعنوانی سے کام لیا۔ اس کے بعد ایم۔ ایل۔ اے۔ نے مراعت کمیٹی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے سکریٹری اسمبلی کے توسط سے پدمیا کے خلاف تحریک مراعات پیش کی کہ انہوں نے ان کی توہین کی ہے۔ اسپیکر نے یہ معاملہ مراعت کمیٹی کے سپرد کردیا۔

مسٹر پدمیا کا کہنا تھا کہ ایم ایل اے نے ان کے بیان کو توڑ مروڑ کر اسے مراعت کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ اور مراعت کمیٹی نے وجہ بتاؤ نوٹس دیئے بغیر ان کے خلاف فیصلہ کیا اور گرفتاری کے وارنٹ جاری کرتے ہوئے دو دن کی قید کی سادہ سزا دی--- پدمیا نے سپریم کورٹ میں اپنی درخواست میں یہ بتلایا کہ ان کے اور ایم ایل اے کے درمیان ذاتی لڑائی پر آزادی کے مراعات کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

سپریم کورٹ میں ایک ڈویژن بنچ نے جو چیف جسٹس اور جسٹس پر مشتمل تھا پدمیا کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے عبوری حکم التواء جاری کیا' اپنے پچھلے فیصلے کی روشنی میں کہ--- اگر کوئی شہری ملک کی اعلیٰ ترین عدالت سے رجوع ہو کر یہ شکایت کرے کہ آرٹیکل ۲۱ زندگی و آزادی کے تحت اس کے بنیادی حق کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو اس صورت میں یہ عدالت کا فرض ہے کہ وہ اس استدلال کے حسن وقبیح کا تجزیہ کرے اور یہ جائزہ لے کہ قانون کے مسلمہ طریقہ کار کے مطابق اس کو تخیلی یا بدنیتی کی وجوہات کے باعث شخصی آزادی سے محروم کردیا گیا ہے تو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کو اس کے دلائل کا تجزیہ کرنا چاہیے اور ایسے مقدمہ میں یہ کہنا ہی جواب نہیں ہوسکتا کہ ایک جنرل وارنٹ کے بعد مزید کوئی عدالتی تحقیق و تنقیح کا سلسلہ روک دیا جائے۔ ورنہ اعلیٰ عدالتوں کو حاصل کردہ اختیارات بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ

ات شہریوں کے حقوق کے لئے دیئے گئے ہیں۔
چنانچہ مسٹر پدمیا اعلیٰ عدالت کا یہ پروانہ لے کر آتے ہوئے جب کہ ان کی بیوی بھی ان کے ساتھ
بتلایا تھا کہ---وہ بذریعہ طیارہ حیدرآباد جائیں گے کہ انہیں یہ احکام جلد از جلد ان نانجاروں کے منہ
لنا ہے۔ پھر وہ اپنی بیوی کو دلی سے اپنے رشتے داروں کے یہاں چھوڑ کر حکم التواء کے ساتھ سائی بابا
یاترا کے لئے شری ڈی گئے تھے اور اس بدنصیب طیارہ سے واپس ہو رہے تھے کہ حادثہ کا شکار ہو گئے۔
حادثہ کے دوسرے دن تباہ شدہ طیارے کے مسافرین اور ارکان عملہ کے رشتہ دار خصوصی طیارہ ایورو
ریعہ پونے کے قریب واقع مقام حادثہ پر پہنچ گئے---وہاں طیارہ کے بازؤں کے ٹکڑے اور ٹائرس
یں تیرتے ہوئے پائے گئے لیکن لاشیں دستیاب نہیں ہوسکیں۔ صرف کچھ نامکمل اعضاء تھے جو پانی میں
میں پھنسے ہوئے تھے---مسٹر پدمیا کی لاش کے ایک پیر کو ان کے فرزند نے پتلون کے ٹکڑے سے
لیا' جس پر ٹیلر کا نشان تھا۔ مسٹر پدمیا ہمیشہ اپنے کپڑے اسی ٹیلر کے یہاں سلوایا کرتے تھے۔---
م کورٹ کی فائل بھی وہاں پانی میں تیرتی ہوئی پائی گئی جس میں سپریم کورٹ کی جانب سے پریولیج کمیٹی
فارش پر اسپیکر ریاستی اسمبلی کی صادر کی گئی دو یوم کی سزا کا حکم التواء تھا۔
مسٹر پدمیا کے پیر پر مشتمل تابوت کو میٹاڈ ورین کے ذریعہ ان کے گھر لایا گیا۔
میں بھی ان سوگواروں میں شامل تھا جب مسٹر پدمیا کی لاش کا صرف ایک پیر تابوت میں رکھ کر لایا
۔ دراصل---تو میں اس وقت وہاں تھا ہی نہیں۔ کیونکہ میری وہاں موجودگی صرف جسمانی طور پر تھی
خیالات میں' میں پدمیا کے ساتھ آفس میں پچھلے دور میں پہنچ گیا تھا۔ جب وہ ترقی کرتے کرتے آفیسر
رسی پر جا بیٹھے تھے۔
مسٹر!'' پدمیا میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے شکر کرو کہ تم ابھی نچلی کرسی پر ہی براجمان ہو۔
کرسی کی تمنا بھی نہ کرو اس زمانہ میں تو اچھا ہے۔''
میں نے پوچھا تھا۔'' وہ کیوں سر؟''
'' تم نہیں جانتے کے اونچی کرسی والوں پر کتنا دباؤ رہتا ہے کہ حقیقت میں وہ نیک نیتی اور ایمانداری
وئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ انہیں صرف وہی کرنا ہوتا ہے۔ جو اوپر والا چاہتا ہے''۔
ارے بھئی! میری مراد اوپر والے بھگوان سے نہیں ہے بلکہ ان کھد بگڑے چہروں سے ہے جو ہر
ن میں بھیک کا چپہ لئے ہمارے اطراف و اکناف گھومتے رہتے ہیں اور پھر الیکشن ہونے کے بعد جب
ان کے چپے میں آ گرتی ہے تو وہ اپنا چولا بدل کر سر پر چڑھ جاتے ہیں۔''

یہ کتابی سبق نہیں۔ اور نہ ہی کسی درس گاہ میں دئے جانے والا سبق ہے۔ بلکہ یہ سبق شعور سے نکلتا ہے اور لاشعور اس کی بنیاد ہے---

ریاض کو عورت ٗ بیک نظر دو ہی حصوں میں نظر آتی .... کمر سے اوپر اور کمر سے نیچے ٗ یعنی آدھی آدھی ......! اس تقسیم کی وجہ اُس کے ذہن میں ٗ نصف بہتر یا اردھانگنی جیسے الفاظ قطعی نہیں تھے ٗ بلکہ اس تقسیم کی زیادہ تر وجہ یہی رہی تھی کہ آدھی عورت ہی ہمیشہ اس کی نظروں کے سامنے رہی جو فیشن ایبل کھلے گلے کے بلاؤز میں ہوتی ٗ جس کی آستینیں نہیں ہوتیں ٗ اور بقیہ آدھی عورت کے تعلق سے وہ کچھ نہیں جانتا تھا ٗ یا پھر جاننے کے لئے اس نے کبھی اس میں دلچسپی نہیں لی تھی--- کیوں کہ آدھی عورت ہی اُسے اتنی اچھی لگتی تھی کہ بقیہ آدھی عورت کے تعلق سے اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا...... چنانچہ وہ آدھا تصور ٗ جو اُس کے نزدیک کچھ نہیں تھا اس کے دماغ سے ہی قطعی طور پر نکل گیا تھا ٗ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو---!

لیکن حمیدہ ٗ ہر عورت کی طرح پوری تھی ٗ جو اس سے بیاہی گئی تھی جب کہ ریاض اپنے ذہن میں صرف آدھی عورت کا تصور ہی لئے ہوئے تھا پوری عورت نہ اُس نے کبھی دیکھی تھی نہ کبھی اس تعلق سے اس نے سوچا تھا۔!

یہاں یہ بات نہیں تھی کہ ریاض شادی کے تعلق سے بھی کچھ نہیں جانتا تھا ٗ بلکہ اُس کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ خود کو بقایا آدھی عورت کی طرف شادی کے بعد بھی مائل نہ کر سکا تھا۔ جس کی ازدواجی زندگی میں از حد ضرورت ہوتی ہے۔

ہاں۔ وہ اس وقت حیرت سے دوچار ضرور ہوا تھا ٗ جب بقایا آدھی عورت جو برہنہ تھی ٗ شادی کے بعد اس کی نظروں سے سامنے آئی تو اُس پر اُسے بڑی حیرت ہوئی ٗ اس طرح جیسے کوئی اسٹرانومیٹ کو دوربین سے کسی نئے سیارے کو دیکھ کر ہوتی ہے کہتے ہیں کہ چاند کا ایک رُخ کبھی بھی دنیا والوں کی نظروں میں نہیں

اور پدمیا کے سر پر چڑھ کر کوئی کام کرا لے ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ جو کچھ ہوا وہ ان کی فطرت کے عین موافق تھا۔

لیکن طیارہ کو حادثہ ہوا کیسے جب کہ وہ اپنی پرواز سے پہلے بالکل ٹھیک تھا اس میں کوئی خرابی نہیں تھی---اس اوجانی ڈیم میں جہاں یہ طیارہ گرا تھا کاک پٹ وائس ریکارڈر (سی وی آر) کی تلاش جاری ہے کہ اُس سے کوئی سراغ ملے---

سراغ ملے یا نہ ملے میں تو تصور میں ہی مسٹر پدمیا کو طیارہ میں محو پرواز دیکھ رہا تھا---وہ سیٹ براجمان تھے۔ ان کی آنکھوں پر موٹا چشمہ چڑھا ہوا تھا جس میں سے ان کی بڑی بڑی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ان کا سر جس پر بال نہیں تھے۔ چمک رہا تھا پسینہ سے۔ اگرچہ وہاں گرمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود انہیں گرمی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا اور ایسے اندر اٹھتی ہوئی وحشت سے کہ--ایک دھماکہ ہوا۔

تابوت کھولا گیا تو اُس میں صرف ایک پیر تھا پدمیا کا میں فوراً پیچھے ہٹا کیونکہ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو آگے بڑھ کر دیدار کرنے کے لئے بے چین تھا--- پیچھے ہٹتے ہوئے میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوال تھا کہ---آخر ان کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟

آتا۔ بالکل اسی طرح عورت کا یہ رُخ بھی ریاض کی نظروں سے ہمیشہ پوشیدہ ہی رہا تھا۔ ہوسکتا ہے' اس لئے اس میں اُسے کوئی رغبت نہ رہی ہو۔

لیکن ایسا کیسے ہوسکتا ہے...... ریاض شادی کے بعد خود کو لاکھ کوششوں کے باوجود جب اس طرف مائل نہ کرسکا تو وہ سوچنے لگا...... کہ کاش! عورت ہمیشہ آدھی ہی رہتی اور وہ صرف اس میں ہی اُلجھا رہتا --- او دوسری طرف زبردستی دھیان لے جانا نہ پڑتا --- یوں بھی ریاض زبردستی کوئی کام کرنے کا سخت مخالف تھا۔

چنانچہ جب ریاض کئی دنوں تک بھی خود کو اس طرف مائل نہ کرسکا تو اس کی بیوی حمیدہ' جو پڑھی لکھی تھی۔ وہ یہ بات بخوبی سمجھ گئی تھی کہ ریاض کچھ ذہنی الجھنوں کا شکار ہے لیکن اس بارے میں وہ کیا جان سکتی تھی' جب تک وہ اس سے کچھ معلوم نہ کرلے اور ریاض اس کو صاف صاف بتلا دینا چاہتا تھا کہ اُس کی ذہنی اُلجھن کیا ہے...... لیکن بتلاتا کیسے......؟

☆☆☆

ایک رات ریاض نے بستر پر حمیدہ کو لئے' جو اُس کے ساتھ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس بارے میں اس سے بات کی۔

''دیکھو حمیدہ!'' وہ بولا ''میں نے بچپن سے لے کر جوانی تک اور شادی سے پہلے آدھی عورت کو ہی دیکھا ہے' کمر تک اور بقایا آدھی عورت کمر سے نیچے ہمیشہ میری نظروں سے دور رہی ہے' اس طرح جیسے وہ تارا اُس نے کھڑکی کے باہر آسمان پر چمکتے ایک تارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا---!

''یہ تو بہت دوری ہوئی ڈارلنگ......!'' حمیدہ ہنستے ہوئے اس سے بولی۔ ''آج کل سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے' وہ منٹوں میں ہی' انسان کو چاند پر پہنچا دیتی ہے...... تمہاری اس دوری کو تو میں جلدی ہی ختم کردوں گی بشرطیکہ تم میرے ایک دو سوالوں کا صحیح صحیح جواب دیدو--- سب سے پہلے یہ بتلاؤ کہ-- جس طرح تم نے عورت کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ تو تمہیں عورت کا کونسا حصہ زیادہ پسند ہے' اور کیوں......؟

ریاض نے رکتے رکتے کہا...... یہ یہ...... یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ڈارلنگ......! بہر حال میرا جواب ہے ''یہ'' کہتے ہوئے ریاض نے حمیدہ کے اوپر جھک کر اُس کے خوب صورت ناف کے گڈھے کے اوپر سے اپنی انگلی لیجاتے ہوئے اس کے اُٹھے ہوئے جوبنوں پر لاکر لگادی۔ ''بس وہاں سے...... یہاں تک......''

''لیکن یہاں تک ہی کیوں......؟ حمیدہ نے اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا'' نیچے کیوں نہیں......؟''

نیچے کی بات سن کر ریاض ایک دم جھینپ گیا۔ اور آنکھیں چراتے ہوئے بولا'' معلوم نہیں کیوں......''

شاید اس لیئے کہ یہاں سینے پر کے یہ دو اُبھار' مجھے دو کبوتر معلوم ہوتے ہیں۔ دودھ کی طرح سفید سفید یہ کبوتر جن کی طرف دیکھ کر کئی بار میں یہی سوچ چکا تھا --- کیا ایسا نہیں لگتا کہ یہ دو کبوتر ہی ہیں' جن کی ٹانگیں چولی کی گانٹھوں میں بندھی ہوئی ہیں اور وہ ہیں کہ اپنی ٹانگیں یہاں پر پھنسی رہنے کے باوجود بار بار اوپر اُڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں......

اس عجیب وغریب منطق پر لیٹے لیٹے حمیدہ نے اپنی چولی میں سے جھانکتے ہوئے ان کبوتر نما جوبنوں کی طرف دیکھتے ہوئے' جو سر اُبھارے ہوئے تھے' جلدی جلدی اپنی پلکیں جھپکائیں......

''ہاں...... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں ڈیر......... کہ میرے بچپن میں ہمارے یہاں کئی ایک کابک تھے' جو ہمہ اقسام کے کبوتروں سے بھرے رہتے تھے''۔ ریاض بولا۔

حمیدہ کی دلچسپی اور بڑھ گئی اُس نے پوچھا...... ''پھر تم نے ان کبوتروں پر اپنے ہاتھ بھی خوب پھرائے ہوں گے ڈیر......!'' وہ چہکی۔

''ہا...... ہاں!...... مجھے ان کے چمچماتے نرم نرم پروں پر ہاتھ پھرانا ہمیشہ اچھا لگتا تھا......'' ریاض نے ایک ندیدے بچے کی طرح مچل کر کہا۔

''لیکن اب تو تمہارے یہاں کوئی کبوتر نہیں ہے......''

''نہیں...... اس لیئے کہ میرے باپ نے انہیں میری تعلیم کو متاثر ہوتے ہوئے دیکھ کر' جب کہ میں اسکول سے آتے ہی اُن کے پیچھے لگ جاتا تھا۔ اُڑا ڈالا تھا' بیچ ڈالا تھا......'' ریاض نے زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''اب سمجھ میں آیا' ڈارلنگ ...... حمیدہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی...... کہ آخر تمہیں آدھی عورت ہی کیوں پسند ہے۔ کیوں کہ تم اپنی نامکمل خواہش کی تکمیل عورت نے جوبنوں پر ہاتھ پھرا کر کرنا چاہتے ہو......؟ کیوں...... ہے نا یہی بات......''

ریاض ایک دم گڑبڑا گیا...... اور غور سے حمیدہ کی آنکھوں میں دیکھنے لگا......

حمیدہ خلاء میں گھورتے ہوئے فوراً سنجیدہ ہوگئی...... اور بولی۔

''دیکھو جانی......! عورت کا یہ حُسن' جسے تم کبوتروں سے تشبیہ دے رہے ہو' عورت کی خوبصورتی تو ہیں ہی اس سے زیادہ یہ ایک ایسا فریب ہیں۔ ایک ایسا جال جس میں عورت ایک مکڑی کی طرح ہی بیٹھی رہتی ہے' شکار کی تلاش میں...... خیر چھوڑو اس بحث کو......'' حمیدہ خیالات کی دنیا سے حقیقی دنیا میں لوٹ آئی اور بستر سے اُٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی...... ''اب تم مجھ سے بھی یہی سوالات پوچھ سکتے ہو' جو میں نے تم

سے پوچھے ہیں--- پوچھو مرد مجھے کہاں کہاں سے اچھا لگتا ہے......''

''ہاں! ہاں!۔ جواب دو اس کا......'' ریاض نے خود ہی اشتیاق سے پوچھا۔

حمیدہ نے بیٹھے بیٹھے اپنی انگلی ریاض کے اوپری ہونٹ پر لگا کر' جہاں ہمیشہ گھنی مونچھیں اُگی رہتیں' وہاں سے انگلی کو نیچے لاتے ہوئے پیٹ کے بالوں بھرے بدوضع گڑھے پر لا کر لگا دی۔

''وہاں سے یہاں تک تو بال ہی بال اُگے ہوئے ہیں' ڈارلنگ......!'' وہ اپنی ناک کو سکیڑتے ہوئے سوں سوں کر کے بولی......''گول گول لچھے دار' خم کھائے ہوئے بال مینڈھے کی طرح...... بلکہ سچ پوچھو تو مرد مجھے نیچے سے اوپر تک ایک مینڈھے کی طرح ہی لگتا ہے جس کی سینگیں بھی وہی سر پر خم کھائی ہوئی رہتی ہیں......''

''یہ تو تم نے مرد کی اچھی خاصی ہجو کر ڈالی...... بلکہ اُس کی ستیاناسی کر ڈالی......'' ریاض نے زور زور سے ہنستے ہوئے اپنے ننگے بدن کو شال سے ڈھکتے ہوئے لیٹ گیا۔

''مرد ہوتا ہی ہے ساڑھے ستیاناسی...... وہ خود تو ستیاناس ہوتا ہی ہے۔ عورت کو بھی ستیاناس کر ڈالنا چاہتا ہے......'' حمیدہ نے کچھ اس طرح تنک کر لچکتے ہوئے کہا کہ ریاض ایکدم جذبے میں آ گیا اور ایک بے خبر پتنگے کی طرح اُڑتا ہوا اس پر آ گرا۔ حمیدہ جو ایک مکڑی کی طرح اپنے جالے میں چوکنا ہو گئی تھی۔ فوراً آگے بڑھ کر اُسے اپنی ٹانگوں میں دبوچ لیا۔

اُسی وقت کمرے کی طرف آتی ہوئی نوکرانی نے جو ہاتھ میں دودھ کا گلاس پکڑے ہوئے تھی...... باہر ٹھہرے ہوئے دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گئی۔ چونکہ کمرے کے اندر کچھ اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

نوکرانی نے تجسس سے ذرا سا...... دروازہ کھول کر اندر جھانکا......اور فوراً ہی پچھلے ہٹ گئی۔

اندر اُس نے دیکھا جیسے وہ ایک مکڑی ہی تھی' جس نے شکار کو اپنے پیروں میں دبوچ رکھا تھا......اور شکار کے منہ سے ایسی بھنبھناہٹ نما آوازیں نکل رہی تھیں' جیسے وہ جالے کے اندر پھنسا ہوا جذبے میں آ کر اپنے نوک دار وجود سے مکڑی کا پیٹ پھاڑ کر اُسے ''سبق'' دینا چاہتا ہے۔

جب کبھی ایک علاقے کا دوسرے علاقے میں الحاق ہونے والا ہوتا ہے تو الحاق ہونے والے علاقے میں ایک زبردست تحریک اٹھتی ہے کہ "نان ملکی گو آوٹ" لیکن اکثر دھوبی بیٹے چاندر ہتے ہیں۔ اور پھٹنے والوں کی آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اتنا اور کہ کہانی میں کے بڑے بھائی، ماں اور والد میرے ہی ہیں اور یہ سب کچھ مجھ پر کسی نہ کسی طرح بیتا ہے۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ وہ کبھی کسی تحریک سے وابستہ رہا، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ نان ملکی تحریک طلباء کے ذریعہ سے زور پکڑتی چلی جارہی تھی، تو وہ اس وقت محض دوسری یا تیسری جماعت کا طالب علم تھا......!

یہ آج سے دس یا پندرہ سال پہلے کی بات ہوگی، جب وہ اسکول میں تھا اور کلاس ٹیچر، بورڈ پر کچھ سمجھا رہے تھے کہ ایک زوردار چھناکے سے اس کے بازو کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تھا۔ تو اس کی کرچیں اچھل کر اس کے ٹیبل پر بکھر گئی تھیں۔ اور وہ پتھر جس سے شیشہ ٹوٹا تھا، وہ ایک زور کی آواز سے ٹیبل پر پڑے بستہ سے ٹکراتا ہوا نیچے گرا تھا۔ تو وہ گھبرایا ہوا بنچ سے اُٹھ کر اس ٹوٹے ہوئے شیشہ سے باہر دیکھتے ہوئے چونک پڑا تھا کیونکہ وہ کالج کے بڑے لڑکوں کا ایسا ریلا تھا جو ہاتھوں میں بینر پکڑے نعرے لگاتا ہوا۔ سنگ باری کرتا، شور مچاتا ہوا چلا آرہا تھا...... اُن ہی میں سے کالج کے ایک بڑے لڑکے نے آگے بڑھ کر چھٹی کی گھنٹی بجادی تھی، تو جماعت کے سارے طلباء ہی باہر نکل آئے تھے، پھر ہیڈ ماسٹر اور ماسٹروں کے لاکھ روکنے کے باوجود بھی اس شوریدہ سر ریلے نے تمام طلباء کو اس طرح ہی اپنے ساتھ بہالے گیا تھا، جیسے خس و خاشاک پانی کے زبردست ریلے میں بہہ جاتے ہیں......

جب ہنگامہ ذرا دور ہوا تھا تو پورے اسکول میں صرف وہی اکیلا باقی رہ گیا تھا، جو اُس ریلے میں نہیں بہہ سکا تھا...... وہ ٹیچروں کے درمیان کھڑا اس ہنگامے کو خوف سے دیکھتا ہکا بکا رہ گیا تھا۔

شام میں گھر پر کھانے کے لئے بیٹھتے ہوئے صبح اپنے اسکول میں پیش آئے، اُس واقعے سے نہ صرف وہ گھبرایا ہوا تھا۔ بلکہ صحیح معنوں میں وہ خوف زدہ تھا کہ اُس کا بڑا بھائی جو کالج میں پڑھتا تھا کھانے کے دوران اُس نے ماں کو بتایا تھا کہ کس طرح اُس نے اور اس کے ساتھی کالج کے تمام لڑکوں نے گلی کوچوں

میں بھی چھوٹے چھوٹے اسکولوں کو چھڑاتے ہوئے نان ملکی تحریک میں شدت پیدا کی۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ نوجوانوں کی تحریک کے آگے بڑی سے بڑی قوت بھی کچھ نہ کر سکے گی۔

اس کا باپ ایک مقامی گورنمنٹ اسکول کا ٹیچر تھا...... اسٹیڈی میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا بولا تھا:

''بیٹے! یہ سب جو تم لوگ کر رہے ہو وہ ٹھیک تو ہے' لیکن مجھے ڈر ہے تو اس بات کا کہ اب کہیں یہاں کا نقشہ ہی نہ بدل جائے...... یہ سب سیاسی کھیل ہیں بیٹے! تم ابھی نوجوان ہو' اس سے کیا واقف' لیکن دیکھ لینا کہ یہاں ایک ایسا سایہ منڈلائے گا جو ریاست کے سارے نوجوانوں کے سروں پر اس طرح محیط ہوگا کہ اُن کے سارے خیالات اور ساری امنگیں' جن سے اب روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں' وہ اس اندھیرے کی نذر ہو جائیں گی اور...... تم سب اس طرح پیچھے دھکیل دیئے جاؤ گے' جس طرح بھیڑ بکریوں کو پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے......!''

''ایسا نہیں ہوگا۔ پتا جی!''...... اُس کے بڑے بھائی نے نوالا اُٹھاتے ہوئے عزم کے ساتھ کہا تھا...... ''آپ دیکھ لینا' ہم کل ہی اس میں اور شدت پیدا کر دیں گے' ہم انہیں اسطرح مجبور کر دیں گے کہ انہیں اپنی رائے تبدیل کرنا ہی پڑے گی''۔

باپ نے ہنس کر کہا تھا۔

''ٹھیک ہے' اگر ایسا ہوا تو تم نوجوان سرخ رو ہی رہو گے'...... لیکن تم یہ بھول رہے ہو بیٹے! کہ اتنی ہی شدت ہمارے گھروں کے دروازوں پر باہر سے بھی ہے' جو انہیں کھول کر اندر گھسنے کے لئے بیتاب ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں جیت کس کی ہوتی ہے......''

وہ دن وجے کے ذہن میں آج بھی اسی طرح نقش ہے' جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔

وہ دن وجے کس طرح بھول سکتا ہے' جب اُس کے بڑے بھائی کو لایا گیا تھا تو وہ سُرخ رو ہی تھا...... اس کا سارا چہرہ خون میں لت پت تھا اور اس کے سینے میں ایک ایسا سوراخ ہو گیا تھا' جہاں سے خون اُبل رہا تھا۔ جیسے دھرتی کی تہوں کو ادھیڑنے پر وہاں سے پانی اُبلنے لگتا ہے۔

گھر میں ایک کہرام مچ گیا تھا...... اُس کی ماں تو روتے روتے غمسے نڈھال ہو کر کئی بار بیہوش ہو چکی تھی' اور باپ پر اس طرح لرزہ طاری تھا' جیسے اس کے سینے میں ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں اور دماغ میں ایسے پٹاخے چھوٹ رہے ہوں' جن کی گونج سے وہ دہل گیا ہے اور...... جب اس کا باپ شمشان گھاٹ سے واپس لوٹ آیا تھا ایسے ہی شانت تھا جیسے ایک طوفان آیا اور گزر بھی گیا۔

اُس رات وہ اپنے باپ کے سینے سے لگ کر سویا تو اس کے نازک اور کومل دل نے باپ کے دل کی

سخت دھڑکنوں کو محسوس کیا تھا...... جو رہ رہ کر اسے اپنے سینے سے چپٹا لیتا تھا تو دل کی دھڑکنوں کی وہ آوازیں کمرے میں دیوار پر لگی' بڑی گھڑی کی ٹک ٹک کی آوازوں پر بھی غالب آجاتی تھیں۔

☆☆☆

بڑے بھائی کے مرنے کے کچھ سالوں بعد گھر کا کیا' بلکہ ہر جگہ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ اب وہ سارے ہنگامے اسی طرح ختم ہو گئے تھے' جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا...... اگر وہ ایک دو کلاس آگے بڑھ چکا تھا' لیکن خود کو وہ اتنا ہی پیچھے محسوس کر رہا تھا' کیوں کہ اس بارے میں اس سے کوئی بات کرنے والا ہی نہ تھا۔ ماں تو ماں ہی تھی' باپ پر ہر وقت ایک چپ سی سوار رہتی تھی۔ صرف شام کے بعد وہ اس سے کبھی کبھار اسٹیڈی میں بیٹھا ہوا سگریٹ پھونکتا اس سے دو ایک سوال اس کی تعلیم کے بارے میں پوچھ لیا کرتا تھا' اس سے آگے کچھ نہیں...... جب کہ وہ اپنے باپ سے بہت سی باتیں جاننا چاہتا تھا...... وہ جاننا چاہتا تھا کہ اب اسکول بار بار بند کیوں نہیں ہوتے...... اب کالجوں سے بڑے لڑکے نعرے لگاتے ہوئے آ۔ آ کر اسکول کیوں نہیں چھڑاتے...... کیا یہ سب اس کے بھائی کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا...... لیکن باپ کی خاموشی کے آگے اسے یہ سب پوچھنے کی کبھی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی......

اس طرح گھر میں رہتے ایک اجنبی کی طرح وجے کو چند سال اور بیت گئے۔ اس دوران اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا اور وہ بے کار رہنے لگا۔

☆☆☆

ایک رات کھانے سے فراغت کے بعد اس کا باپ اسٹیڈی میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا' اور وہ میٹرک پاس کر کے بے کار رہنے کے بجائے سوچ رہا تھا کہ کالج میں داخلہ لے لے' کیوں کہ نوکری کے آثار فی الحال کوئی نظر نہیں آ رہے تھے' کہ اس کے باپ نے اُسے آواز دی اور اپنے پاس بلا کر اُس سے کہا:

''دیکھو! کل صبح تیار رہنا' میرے ساتھ چلنا ہے تمہیں...... میں تمہیں ریونیو اتھارٹی سے مستحقی کا صداقت نامہ---(Eligibility Certificate) دلا دوں گا......'' کہتے ہوئے اُس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اپنے اندر کھینچا' پھر منہ سے خلاء میں دھواں چھوڑتے ہوئے بولا...... ''لے لو' شاید یہی آئندہ تمہارے کام آجائے پھر معلوم نہیں بعد میں اس کی کوئی وقعت رہ بھی جائے یا نہیں...... فی الحال اسے لے لینا ضروری ہے......''

ایک ایسا صداقت نامہ باپ نے اُسے ریونیو اتھارٹی سے دلا دیا تھا' جو اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ

فلاں شخص، فلاں کا بیٹا فلاں جگہ رہنے والا، جس نے اپنی رہائش کا ثبوت پیش کیا ہے، یہیں کا باشندہ ہے۔ اس لئے تصدیق کی جاتی ہے کہ وہ یہاں کسی بھی سرکاری جائیداد پر تقرر کے لئے حقدار ہے۔

صداقت نامہ میں دو ایک حوالہ بھی دیئے گئے، جو کسی مخصوص سال سے متعلق تھے۔ اس صداقت نامہ پر اُس نے اپنے ہی دستخط ثبت کر کے اُسے حاصل کیا تھا۔ صداقت نامے کی پیشانی پر ایک گول سرکاری مہر بھی لگی ہوئی تھی جس کو دیکھ کر وجے نے اپنے اندر بڑا سکون محسوس کیا تھا...... ایسا سکون وہ ہمیشہ اپنے اندر اُس وقت بھی محسوس کیا کرتا، جب وہ زو (Zoo) میں شیر کو پنجرے کے اندر بند دیکھتا......

☆☆☆

پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ یہاں ایسے ہی حالات پھر سے پیدا ہو گئے، جیسے کہ اس وقت تھے جب کہ وہ محض دوسری یا تیسری جماعت کا طالب علم تھا، ...... وہی نعرے بازی، وہی توڑ پھوڑ ...... ویسے ہی کلاسوں کا بائیکاٹ ...... لیکن اب ان نعروں کی لے بدل گئی تھی، چونکہ باہر سے آنے والا ریلا، گھروں کے دروازوں کو توڑ کر اندر گھس آیا تھا اور یہ ایک ایسا ہی طوفان تھا، جس نے ہر چیز کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

باہر سے آنے والا یہ ریلا اور اس ریلے میں ان نو واردوں پر ہر کسی کو بڑا تعجب ہوا تھا کہ وہ برہنہ پا ایسے ہی تھے جیسے ٹڈی دَل جو اپنے خاردار پیروں سے بھنبھناتا ہوا دیکھتے ہی دیکھتے کھیتوں کے کھیتوں کو صفاچٹ کر جاتا ہے۔

اُن حالات کا صحیح تجزیہ اس کے باپ نے اپنی ڈائری کے ایک ورق پر اس طرح کیا تھا۔

''ان ٹڈی دلوں کی یلغار ہنوز جاری ہے، اور کھیتوں کے کھیت صفاچٹ ہو رہے ہیں، جلد ہی یہاں کے لوگوں میں تنگیٔ معاش کے سے حالات پیدا ہونے لگیں گے۔ جن میں روزگار سے لے کر حصول تعلیم تک اور ایسے ہی کئی مسائل رہیں گے۔ جن میں ان کی حیثیت بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہیں ہوگی، جن کو ہنکا کر پیچھے کر دیا جاتا ہے......''

چنانچہ اب ان نعروں سے لفظ نان ملکی کا نچوڑ یا حاصل ایسی تحریک بن کر آ گا تھا جس میں تحفظ کا درجہ اولین تھا، امر تحفظ کے لئے جو موزوں الفاظ نعروں کی شکل میں ترتیب دیئے گئے تھے، وہ دستوری ڈھانچے کا جز ہی تھے، کیونکہ وہ مقامی لوگوں کی بھلائی اور انہیں حق دلانے کے تعلق سے تھے۔

لیکن حیرت انگیز طور پر اُن نعرون کی گونج وجے کو ذرا بھی نہیں ہلا سکی تھی ...... کیونکہ اُسے اپنے بھائی کی موت ابھی بھی اچھی طرح یاد تھی کہ کس طرح نعرے لگاتے ہوئے۔ اس کے سینے میں سوراخ ہو گیا تھا، جہاں سے خون ابل رہا تھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔

چنانچہ ایک دن احتجاجیوں کے جتھے جب کالج میں گھس آئے تھے اور وہ ایسے ہی نعرے لگا رہے تھے تو وجے ایک طرف چپ چاپ سرک کر اس تماشہ کو غور سے دیکھنے لگا تھا...... اس کی ساتھی لڑکی نرملا نے جو خود بھی احتجاجی تھی، اور جس کو وہ پسند کرنے لگا تھا، اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی:

''چلو آؤ! ہمارے میں شامل ہو جاؤ وجے! اور نعرے لگاؤ، اسی میں ہم لوگوں کی بھلائی ہے......'' تو وجے نے اپنا سخت اور کھردرا ہاتھ، نرملا کے نرم و نازک ہاتھ سے چھڑا لیا تھا...... ''نہیں! تم جاؤ'' اس نے کہا تھا ''میرا راستہ دوسرا ہے۔''

اُس دن وجے گھر لوٹا تھا تو اس کا باپ اچانک ہی اس دنیا کو چھوڑ چکا تھا۔ غالباً اس کے دل کو ایک زمانے بعد پھر ایسا ہی دھچکہ لگا تھا، جیسا کہ اس کو اپنے بڑے بیٹے کی جدائی کے وقت لگا تھا......

اُس رات شمشان گھاٹ سے لوٹنے کے بعد وجے اکیلا ہی کمرے میں سویا تھا تو وہ خود اپنے دل کی دھڑکنوں کو اتنی ہی زور سے سن رہا تھا کہ کلاک کی ٹک ٹک کی آوازیں بھی ان میں دب کر رہ گئی تھیں......

کتنے ہی دنوں تک وجے اپنے باپ کی جدائی کے غم سے بے حال رہا تھا۔ کسی کام میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ پڑھنے لکھنے میں بھی نہیں۔ ماں، جس کو شدید دمہ کا عارضہ لاحق تھا۔ جس سے اس کی حالت اُس سے بھی کہیں زیادہ خراب رہتی تھی، وہی اسے ہمت دیتی رہتی۔

ایک دن صبح وجے بستر سے اُٹھ کر کالج جانے کی فکر میں تھا اور تیار ہو کر باہر نکل رہا تھا کہ پوسٹ مین نے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما دیا۔ جو اسی کے نام تھا...... لفافہ میں انٹرویو کال لیٹر تھا اور اُسے آج ہی انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔

نوکری کی تو اُسے ویسے ہی سخت ضرورت تھی۔ کیونکہ باپ کے انتقال کے بعد ماں پر جو وظیفہ اُترا تھا۔ وہ اتنا ہی کم تھا کہ اُس سے ایک کمرے کا کرایہ بھی ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کے ٹیوشن کی آمدنی، جس کو وہ چھوٹی چھوٹی کلاسوں کے بچوں کو پڑھا کر حاصل کیا کرتا تھا اور ماں کا وظیفہ ملا کر گھر کے خرچے کے لئے ہمیشہ ہی ناکافی ہوا کرتے۔ اور وہ ہمیشہ زائد آمدنی کی فکر میں لگا رہتا تھا --- اب اس کال لیٹر میں اُسے اُمید کی ایسی کرن نظر آئی، جس سے اُس کی زندگی میں، اگر اس کا تقرر ہو جاتا ہے تو، بہت کچھ ہو سکتا ہے --- ماں کی بیماری کا بھی خاطر خواہ علاج ہو سکتا ہے اور وہ نائٹ کالج کے ذریعہ آگے بھی پڑھ سکتا ہے، اور کالج کی اسی لڑکی نرملا سے شادی بھی رچا سکتا ہے، جس کے جھکاؤ کو وہ کافی دنوں سے اپنی طرف محسوس کرنے لگا تھا۔

اس خیال سے ہی کال لیٹر لے کر وجے ویسے ہی اُلٹے قدموں اپنی ماں کے پاس سیدھا پہونچا تاکہ وہ ماں کو یہ خوش خبری سنا کر اس کا آشیرواد لے۔

ماں بستر پر گٹھری کی طرح اوندھی پڑی ہوئی تھی، اس کی سانسیں بُری طرح چل رہی تھیں---ماں اکثر کہا کرتی تھی کہ جب سانسیں تیز چل رہی ہوں تو اس طرح اوندھے لیٹنے میں ذرا آرام سا ملتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے کہ ماں کو اٹھانے میں تکلیف ہوگی وہ صرف ماں کے پیر پڑ کر ہی انٹرویو کیلئے چل پڑا تھا......

انٹرویو لینے والے ان چاروں آفیسروں کی آٹھ چھبتی ہوئی آنکھیں اس پر اس طرح ہی جمی ہوئی چھبتی تھیں، جیسے وہ آٹھ آنکھیں نہیں بلکہ آٹھ ڈرل کی سلاخیں ہیں، جو اس کے جسم میں سوراخ کرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں، اور ان سے خون اُبل رہا ہے۔ جیسے زمین کی تہوں کو ادھیڑنے کے بعد وہاں سے پانی اُبلتا ہے......وجے نے گھبرا کر جلدی جلدی اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ تو وہ چاروں کے چاروں اُس پر ایسے ہی بے تکے سوالوں کی بوچھار کرنے لگے جن کا نہ تو کوئی سر تھا، نہ پیر......! تب ہی اُسے یاد آیا کہ کس طرح بچپن میں ایک بار وہ سوئمنگ پول گیا تھا، تیرنا سیکھنے کے لئے---تو تیرا کی سکھانے والے انسٹرکٹر نے اُس سے پوچھا تھا......" کیا تم پانی سے ڈرتے ہو؟ تو جھٹ اس نے جواب دیا تھا۔ "نہیں......میں پانی سے ڈرتا نہیں، بلکہ پانی پیتا ہوں"۔ تو انسٹرکٹر نے فوراً اسے یہ کہہ کر۔ "پھر تم تیرنا نہیں سیکھو گے......اُسے ری جیکٹ کر دیا تھا......

معلوم نہیں مجھے یہاں سے کیوں ریجیکٹ کر دیا گیا ہے؟ وجے نے سوچا--جبکہ میں نے یہاں کوئی ایسی بات بھی نہیں کہی۔ میں تو میٹرک میں اول نمبروں سے پاس ہوا ہوں اور میں اس علاقے کا شہری بھی ہوں۔ مستقی کا صداقت نامہ بھی میرے پاس ہے۔ پھر وہ ان چاروں کی نگاہوں کا مرکز بھی تو بنا ہوا تھا......

لیکن جب وجے یہاں سے باہر نکل رہا تھا تو مایوس ہی تھا......نکلتے ہوئے اس نے دیکھا، اس کے پیچھے جو دوسرا نوجوان داخل ہوا تھا اُس کا تعلق اُسی ٹڈی دل سے تھا، تو کن آنکھیوں سے اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اُن آفیسروں کے چہرے ایسے ہی کھل اُٹھے تھے، جیسے بند کلی کو کھلنے سے پہلے ہی کھول دیا گیا ہو......

وہاں سے ناکام لوٹتے ہوئے وجے کے سارے جسم میں اسی طرح کا لرزہ طاری تھا جیسا کہ اُس کے باپ کے سینے میں اپنے بیٹے کی موت کے وقت تھا......اس کے سینے میں بھی ویسے ہی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے اور دماغ میں اسی طرح کے زوردار پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔

پل پر سے گزرتے ہوئے جو گھر لوٹتے اور گھر سے باہر کہیں جاتے ہوئے ہمیشہ درمیان میں رہتا تھا، وہاں سے وجے نے نیچے جھانک کر دیکھا......ندی اسی طرح پرشور آواز سے بہہ رہی تھی، جیسی روانی سے خون اس کے جسم میں گردش کر رہا تھا، اور ندی کی اُن اونچی اونچی لہروں میں اس کا خیال تھا کہ اگر وہ پل پر سے اپنا ہاتھ نیچے لٹکا دے گا تو پانی کی یہ لہریں اُچھل کر اُس کے ہاتھ کو چھو ہی لیں گی۔

کچھ سوچ کر وجے نے جھٹ اپنا بیگ کھول لیا، جو کپڑے کا بنا ہوا تھا اور اس کے کاندھے سے

لٹکا جھول رہا تھا...... اس میں سے صداقت نامہ باہر نکالتے ہوئے وجے کو اپنے باپ کے وہ جملے یاد آ گئے۔ جو اس نے صداقت نامہ دلانے سے قبل اُس سے کہے تھے۔

''لے لو۔ اسے شاید اب یہ ہی تمہارے کام آ جائے' پھر معلوم نہیں بعد میں اس کی وقعت رہ بھی جائے یا نہیں۔''

''اس کی وقعت اب کیا رہ گئی ہے؟'' وجے نے خود سے سوال کیا' اور جواباً بہ احترام اس کو' جو اس کے باپ کی ایک یادگار بن گیا تھا اور جس کو اس کے باپ نے یہ سمجھ کر دلایا تھا کہ وہ اس کے کام آئے گا' فوراً ندی کے بھینٹ چڑھا دیا۔ اس طرح جیسے کبھی اس نے اپنے باپ کی استھیاں بھی گنگا کی نذر کی تھیں......!

استھیوں کو مقدس گنگا کی لہریں اپنے ساتھ بہا لے جا رہی تھیں تو پانی میں ایک بھنور سا پیدا ہو گیا تھا' ٹھیک اسی طرح صداقت نامہ جو چوبی فریم میں چاروں طرف سے جکڑا ہوا تھا' ندی کی بھینٹ چڑھتے ہی چکر کھاتے ہوئے پانی میں ڈوبنے لگا' پھر وہ تھوڑی دیر تک تیرتا بھی چلا جاتا کہ ایک اونچی لہر نے اُسے آدھے سے زیادہ اندر کھینچ لیا۔

تب ہی وجے کو اپنے کندھوں پر پیچھے سے کسی کے ہاتھ کا بوجھ محسوس ہوا۔ یکدم وہ گھبرا کر پلٹا تو دنگ رہ گیا......

وہ نرملا تھی' جو ندی کی لہروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

''اب تمہارا راستہ کدھر ہے وجے...... آؤ میرے ساتھ...... ہم کل ہی کالج کے سامنے کیمپ میں بھوک ہڑتال پر بیٹھ رہے ہیں''۔

وجے نے غور سے نرملا کی آنکھوں میں دیکھا' جہاں عزم و حوصلہ دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا...... جیسے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے اپنے سینے میں سوراخ بھی دلا سکتی ہے' جس سے تازہ تازہ خون اُبلے گا' اس طرح جیسے زمین کی تہوں کو ادھیڑ کے بعد وہاں سیپانی بلبلوں کی شکل میں آنے لگتا ہے۔

نرملا کی آنکھوں میں ایسی دیوانگی دیکھ کر وجے کچھ گھبرا سا گیا۔ اور فوراً پلٹ کر ندی کی پُر شور لہروں کی طرف دیکھنے لگا۔

نرملا کب وہاں سے چلی گئی -- اسے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔

وہاں سے واپس اپنے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے اس کے سینے میں ایک دھکڑ پکڑ سی مچی ہوئی تھی' وہ چاہتا تھا کہ جلدی سے جلدی گھر پہونچ جائے اور سکون سے چند گھنٹوں کیلئے آرام سے سو جائے۔ لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اُس نے اپنے گھر کے سامنے ایک بھیڑ کو جمع ہوتے دیکھا' جو آہستہ آہستہ بڑھتی ہی چلی

جا رہی تھی...... وہ پریشان ہو گیا اور تیز تیز قدموں سے دوڑتا ہوا بھیڑ کو چیرتا گھر کے اندر پہونچا تو اس کی ماں پلنگ پر چت پڑی ہوئی تھی' اس طرح کہ اس کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں اور وہ یوں ہی غیر متحرک تھیں' جیسے کسی کی آمد کے انتظار میں وہ جھپکنا تک بھول گئی ہیں۔

''ماں کو میرا ہی انتظار تھا۔'' وجے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ تو اس کی آنکھیں ایسے ہی خشک تھیں' جیسے وہاں زندگی بھر آہوں اور کراہوں میں آنسوؤں کے سوتے بھاپ بن کر اڑ گئے ہوں۔

اسی حالت میں شمشان گھاٹ سے ماں کے انتم سنسکار کے بعد بھوک ہڑتال کیمپ پہنچا۔ جہاں نرملا ساتھی لڑکیوں اور کالج کے دیگر لڑکوں کے ساتھ کیمپ میں موجود تھی۔ وہ سب بھوک ہڑتال پر بیٹھے تھے۔ اور کیمپ میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

وجے کیمپ میں داخل ہوا اور سیدھا نرملا کے پاس پہنچا اور اس کے سامنے بیٹھ کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

نرملا چند لمحہ غور سے وجے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے اپنے ہونٹوں کو آہستہ سے حرکت دی' تو ان سے صرف ایک لفظ نکلا ''وجے!'' جس کو وجے کے تیز کانوں نے فوراً نگل لیا۔ اس طرح جیسے وہ ایک ایسا ڈوز تھا جس سے اس کے جسم میں ایسی توانائی پیدا ہو گئی کہ اس نے فوراً اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں تو اس میں ویرانی کی جگہ عزم و حوصلہ کے ساتھ ساتھ ایسی دیوانگی بھی شامل تھی جیسے یہ اونچے سے اونچے پہاڑوں کے سینوں کو بھی روند ڈالے گی......!

آخرت

فطرتاً انسان بُرا نہیں ہوتا لیکن کاہلی اور از خود پیدا کردہ بے کاری اسے غلط راہ پر ڈال دیتی ہے' جب کوئی راہ نہیں سوجھتی سوائے پچھتاوے و شرمندگی کہ تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے---

وہ چور نہیں تھا' بلکہ اُس کا کسی چیز کو حاصل کرنے کا طریقہ غلط تھا اس لئے وہ چور کہلایا۔

وہ ہمارا ہی کرایہ دار تھا اُس کا نام افضل تھا...... اُس کا حُلیہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے ایک شریف آدمی کا ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بال سلیقے سے جمے ہوئے اور کپڑے صاف ستھرے جو اکثر قمیص اور پاجامہ ہی ہوتے۔ اگرچہ اُس کے پیٹ میں حروف تہجی کا ایک لفظ نہیں تھا پھر بھی وہ ایسا نہیں لگتا تھا۔

اُس کا باپ شرف الدین ایک نہایت ہی شریف آدمی تھا' اُس کی نوکری سرکاری تھی چنانچہ وہ شرافت کی زندگی گزارنا زیادہ پسند کرتا تھا جب کہ اُس کا بیٹا افضل جو بے روزگار تھا اور پڑھا لکھا بھی نہیں۔ شرف الدین کے لئے مسلسل دردسر بنا رہا۔

افضل اگرچہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن باپ چونکہ ایک شریف آدمی تھا اس لئے کچھ کچھ شرافت اُس کے خمیر میں بھی تھی جو بسا اوقات اس طرح ہی اُجاگر ہوتی تو خیال جاتا کہ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا بلکہ اپنے باپ کی طرح شریف ہوتا اور کسی جگہ کم از کم ٹک کر ہی نوکری کر لیتا۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ محض شرف الدین کی بیوی زینب کے بے جا لاڈ پیار نے ہی افضل کی زندگی برباد کر ڈالی۔ بعد از قیاس تھا چونکہ اس میں زیادہ تر اس بُری صحبت کا ہی اثر تھا جو افضل کو حمید کی شکل میں ایک بُرے ساتھی کے روپ میں ملا۔

حمید' زینب کی بہن کا ہی لڑکا تھا لیکن پکا چور اور زینب کی بہن بھی اپنے بیٹے کی طرح گانٹھ کی پوری پکی تھی...... اس کا شوہر جو ایک شریف آدمی تھا چھینکے میں انڈے رکھے گلی گلی پھرتا' ہانک لگاتا تھا...... انڈے وانڈے...... وہ' ان دونوں سے ہی متنفر تھا جن کی عادتیں خراب تھیں۔

حمید کو چوری کا حوصلہ اپنی ماں کی طرف سے ہی ملا تھا جس کو وہ بُرا نہیں سمجھتی تھی بلکہ وہ اپنے بیٹے کی پیٹ ٹھوکتی تھی اُس ماں کی طرح جس کا لڑکا کلاس میں اول نمبروں میں پاس ہوا ہے۔ زینب بھی اس لئے

خاموش رہتی تھی کہ معاملہ چونکہ اپنی بہن کے لڑکے کا تھا......اب بھلا وہ افضل کو کیسے ٹوک سکتی تھی کہ وہ حمید کی صحبت میں نہ جائے......جس میں سے افضل ان راہوں پر نکل پڑا جس میں ہمیشہ پولیس کا ڈر لگا رہتا۔

حمید تو پولیس کی ماروں کو کپڑوں کی دھول سمجھتا تھا لیکن افضل جو کہ ذرا کمزور دبلا پتلا تھا ماروں سے بے حد گھبراتا تھا' اس کے باوجود دونوں ہی مل کر چوری کرتے تھے اور افضل ہی جیسے پکڑا جاتا جو پولیس کے ڈنڈوں سے گھبرا کر حمید کا نام بھی بتلا ڈالتا تھا۔

مزید تفتیش کیلئے جب پولیس افضل کو لے کر اس کے گھر پہنچتی تو شرف الدین مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا۔ پھر بھی اس خیال سے کہ اگر افضل کو جیل ہو گی تو وہ حمید کی طرح جیل سے باہر آ کر نڈر ہو جائیگا۔ پیسہ پانی کی طرح بہا کر افضل کو جیل کی سزا سے بچا لاتا۔

ایسا کئی وقت ہوا۔ اور شرف الدین ہمیشہ اپنے بیٹے افضل کو چھڑانے میں گلے گلے تک قرض میں ڈوب گیا......

پھر شرف الدین نے اپنی بیوی زینب کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ افضل کے پیروں میں شادی کی بیڑی ڈال دینی چاہیے تا کہ وہ گھر بار کا ہو جائے اور خراب عادتیں چھوڑ دے۔

چنانچہ ایک دن شرف الدین نے افضل کو جو رات کا کھانا کھا کر آوارہ گردی کے بعد بستر پر آ کر لیٹا ہی تھا کہ اُسے بلایا اور بتلایا:

''دیکھو! اب تم اچھے خاصے جوان ہو گئے ہو اور شادی کے لائق۔ اب تم ہمیشہ کے لئے ایسے تمام خراب کام چھوڑ دو جس میں پولیس کا ڈر ہو......اور ایک نیک آدمی کی طرح زندگی گذارو' میں تمہاری شادی کرنے والا ہوں۔ اگرچہ تمہیں کوئی بیٹی دیگا نہیں لیکن میری شرافت کو دیکھ کر شائد کوئی راضی ہو جائے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ اور اپنا الگ گھر بساؤ یا پھر میری زندگی پر مزید بٹہ لگا کر مجھ کو موت کے منہ میں دھکیل دو......

اپنی تمام کوششوں کے باوجود بھی جب شرف الدین افضل کے لئے کوئی لڑکی نہیں ڈھونڈھ سکا تو وہ مایوس ہو گیا......لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خود سے حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ امید بندھ گئی کیوں کہ افضل جس کارخانے میں کچھ دنوں سے باپ کے سمجھانے بجھانے پر جانے لگا تھا وہ نڑلوں کا ایک معمولی سا کارخانہ تھا...... جہاں ساگودانہ' بیسن اور دوسری اشیاء کی آمیزش سے چھوٹی چھوٹی انگلیوں کی وضع کی گول چیز بنائی جاتی تھی جس کے بیچ میں ایک سوراخ ہوتا جس کو تل کر کھانے پر وہ بڑا مزا دیتے...... بازار میں نڑلوں کے نام سے اس کا کافی سیل تھا جس کو بچے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ کام چونکہ معمولی تھا اس لیئے اس میں لڑکیوں کی ہی زیادہ کھپت تھی ایک دو لڑکوں کے سوائے جو مشین پر اُن انگلیوں کی وضع کے نڑلے کٹنگ

کرتے ہوتے ...... وہاں ایک حسین وجمیل لڑکی بھی آتی تھی ...... پستہ سا قد رگوری گٹی ناک نقشہ اچھا لیکن نہایت ہی کم گو نہ جانے اُسے افضل میں کیا خوبی نظر آئی کہ اُس کا جھکاؤ افضل کی طرف ہو گیا...... افضل کو اور کیا چاہیئے تھا صرف دو آنکھیں۔ چنانچہ دونوں ہی میں اتنی اُنسیت پیدا ہو گئی کہ وہ ماں باپ کی مرضی لئے بغیر ہی سول میرج کر ڈالی...... افضل تو اتنا ہوشیار تھا نہیں یہ محلے کے نوجوانوں کی ہی کارستانی تھی کہ انہوں نے اس نیک کام میں دیر نہیں کی اور افضل کی اس میں خوب مدد کی جس سے ایک دن دونوں کورٹ میں شادی کے بندھوں میں بندھے گئے......

شرف الدین کو بھی اطمینان ہو گیا کہ اب افضل گھر دار کا ہو کر رہے گا۔

لیکن افضل میں جو ایک خرابی کی لت پڑی ہوئی تھی وہ گئی نہیں۔ کیونکہ وہ جس کارخانے میں کام کرتا تھا وہاں سے ایک رات مشین اُڑا کر اپنے گھر لے آیا کہ وہ بھی ایک کارخانہ کھول لے گا...... لیکن یہ محض ایک خام خیالی تھی چنانچہ وہ گرفتار ہوا اور پولیس سے بے بھاؤ کی مار کھائی۔ جب گھر لوٹا تو چہرہ سوجھا ہوا تھا' ہاتھ پاؤں پر جگہ جگہ زخم تھے اور ٹھیک طرح سے چلنا بھی نہیں آ رہا تھا صرف لنگڑا رہا تھا۔ یہ تو شرف الدین کی کوشش تھی کہ وہ اسے پیسے کے بل بوتے پر جیل کی سزا سے چھڑا لایا تھا......

ایسے کئی چھوٹے موٹے حملوں میں مار کھاتے اور شرف الدین کے پیسے کے بل بوتے پر افضل جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے سے بچتا رہا اور اس دوران اس کے چار بچے بھی ہو گئے۔

اُدھر شرف الدین کی نوکری کی معیاد بھی ختم ہو رہی تھی اور وہ وظیفے پر ریٹائیرڈ ہونے والا تھا تو ایک دن وہ...... افضل کو اپنے پاس بلایا اور اُسے سمجھایا۔

''دیکھو! میں نے تمہیں سدھارنے کی بہت کوشش کی اور اس کے لئے اپنے پیسے کو پیسا نہیں سمجھا اس خیال سے کہ کہیں تم جیل کی ہوا کھا کر باہر نکلو تو اُس آوارہ لونڈے حمید کی طرح کہیں پکے چور نہ بن جاؤ اور تمہاری ہمت نہ بڑھ جائے -- اب میں ریٹائیرڈ ہونے والا ہوں۔ پیسہ تو میرے پاس پہلے کی طرح ہوگا نہیں کہ میں تمہاری بد چلنی پر ہمیشہ تمہاری مدد کرتا رہوں' اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اپنے آپ کو سدھارو یا پھر مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لو اور کہیں الگ رہ کر اپنی زندگی بسر کر لو۔ لیکن یاد رکھو میرے ساتھ رہ کر تم نے اپنی چال ایسی ہی رکھی تو میں پہلے اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا گھونٹ دوں گا پھر تمہاری بیوی اور تمہارے بچوں کو کسی کنویں میں جھونک دوں گا......''

افضل اپنا سر جھکا کر یہ سب سنتا رہا اور چپکے چپکے اندر ہی اندر روتا بھی رہا۔ اپنی اس لااُبالی زندگی پر جس میں اُس کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہ رہی تھی اور نہ ہی اُسے کوئی مستقل نوکری ملی تھی جس سے وہ اپنے باپ کی انا کو قائم رکھ سکتا...... تاہم اُس نے وعدہ کیا کہ اب کی بار وہ کبھی اپنے باپ کی خدمت میں شرمندہ سر لئے حاضر نہیں ہوگا۔

دوسرے ہی مہینے شرف الدین کو وظیفہ ہوگیا...... چونکہ وہ ایک بے حد شریف آدمی تھا اس لئے وہ میرے پاس آیا اور معذرت چاہی۔

"ہماری وجہ سے آپ کے گھر بار بار پولیس آتی رہی لیکن آپ نے کبھی مجھ سے اس تعلق سے کچھ باز پُرس نہیں کی اور نہ ہی کبھی ناراضگی کا اظہار کیا...... اب میں اس مکان کو چھوڑ رہا ہوں اور ایک دوسرے چھوٹے مکان میں منتقل ہو رہا ہوں جس کا کرایہ میرے وظیفے کے حساب سے کچھ کم ہے"

میں نے کہا: "دیکھو شرف الدین تم اگر مکان چھوڑ رہے ہو تو یہ تمہاری مرضی ہے لیکن لڑکے کے تعلق سے کہوں گا اگر میرا بھی کوئی لڑکا ہوتا اور وہ ایسا ہی ہوتا تو میں کیا کرتا......"

پھر اسکے بعد کئی مہینوں تک ان لوگوں کی کوئی خبر ملی نہیں اور اس کا بھی پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چلے گئے......

ایک دن صبح میں ناشتے کیلئے بیٹھا ہی تھا کہ ایک لڑکے نے آکر اطلاع دی...... "افضل کا انتقال ہوگیا......"

میں ایک دم چونک پڑا اور قبل اس کے کہ اُس سے پوچھتا کہ کیسے...... وہ چلا گیا۔

بہت دیر تک میں اس خیال میں ڈوبا رہا اور سوچتا رہا کہ شرف الدین پر کیا گذر رہی ہوگی اُس کی ماں کا کیا حال ہوگا اور اس سے زیادہ اس کی جوان بیوی اور چار بچوں کا کیا ہوگا......

میری بیوی زہرہ جو باورچی خانے میں مصروف تھی لیکن اس کے باوجود اُن کے کان ہمیشہ میری ہی طرف لگے رہتے وہ باہر آئی اور صبح کا تازہ اخبار میرے سامنے رکھ کر ایک کالم پر انگلی رکھتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ذرا اس کو پڑھو۔

اخبار کی سرخی کچھ اس طرح تھی...... (سرقے کی ناکام کوشش کے بعد ایک نوجوان کی خودکشی)

حیدرآباد۔ ۵/اپریل (ریاست نیوز) ایک نوجوان نے آج مشیر آباد کے علاقے میں اسٹیل کے چند برتنوں کے سرقے کی ناکام کوشش کے بعد خودکشی کرلی۔ پولیس نے بتایا کہ گاندھی نگر کے علاقے میں آج ایک ۲۸ سالہ شخص جس کے بال ہپی کے طرز کے تھے ایک اسٹیل فیکٹری پہنچا اور محافظین کی نظریں بچا کر (۱۹) چھوٹے چھوٹے برتن اپنی شرٹ میں چھپالئے۔ لیکن فیکٹری کے ملازمین کو شبہ ہوا اور انہوں نے نامعلوم نوجوان سے پوچھ گچھ کی کوشش کی جس پر نوجوان بھاگ کھڑا ہوا۔ ملازمین نے اُس کا پیچھا کیا' اتنے میں نوجوان نے قریب میں واقع ایک موچی کی دکان سے رمپی نکالی اور اس سے اپنے دائیں پاؤں کی رگ کاٹ لی اس سے نوجوان برسرموقع ہلاک ہوگیا۔ اسٹنٹ کمشنر پولیس نے مقام واردات کا دورہ کیا۔ مشیر آباد کے انسپکٹر پولیس تحقیقات کررہے ہیں نعش کو شناخت کے لئے مردہ خانہ گاندھی ہاسپٹل میں محفوظ کردیا گیا۔

"اٹھائیس سالہ شخص...... بال ہپی طرز کے......" خبر کو دوبارہ پڑھتے ہوئے میں بڑبڑایا...... "کون ہوسکتا ہے یہ......"

''افضل'' زہرہ نے کہا---''تمہیں کیسے معلوم......'' میں نے تجسس سے پوچھا......

''کچھ دنوں پہلے وہ یہاں آیا تھا اپنے دوستوں سے ملنے......اُس کے بال اسی طرح بڑھے ہوئے تھے جیسے آج کل کا فیشن بن گیا ہے''۔

میں حیران رہ گیا!

''شاید تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے یہاں آنے سے بہت پہلے وہ جس مکان میں مقیم تھے وہاں ایک لڑکی تھی سانولی سی، جس کا قد بوٹا سا تھا لیکن تھی اتنی تیز کہ اُس نے افضل کو جو اُس کے عشق میں آہیں بھر رہا تھا ذرا بھی لفٹ نہیں دی تھی تو افضل نے اُسے ڈرایا دھمکایا تھا کہ اگر تم مجھ سے شادی نہیں کروگی تو میں زہر کھالوں گا......لڑکی نے کہا تھا......''کھالو......مجھ سے کیا پوچھتے ہو......'' تب افضل نے واقعی چوہے مار دوا کی ایک بڑی شیشی پوری کی پوری کاگ کھول کر اپنے پیٹ میں اتار لی تھی اور چکرا کر وہیں گر پڑا تھا اور بے ہوش ہوگیا تھا......گھر میں ایک کہرام مچ گیا تھا۔ کہ کیا کریں چونکہ گھر میں مرد کی کوئی صورت نہیں تھی......تب محلے کے چند نوجوانوں نے مل کر اُسے دواخانہ میں داخل کروایا تھا''

''لیکن شرف الدین نے مجھ سے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا......''

''کیسے کرتے......اگر کرتے بھی تو تم نظر انداز کر دیتے لیکن دوسرے......''

''تب ہی سے وہ خون کی قے کرنے لگا تھا' اُس کی صحت کی خرابی کی یہی جہ تھی شائد......'' کہتے ہوئے وہ پھر باورچی خانہ چلی گئی......

دوسرے دن صبح چائے پر پھر وہی قصہ دہراتے ہوئے زہرہ نے متاسفانہ لہجہ میں کہا......

''بے چارے کی آخرت کا بھی خرابہ ہوگیا......ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے نام پر اس کے جسم کی ایک ایک چیز نکال لی گئی تھی اور اس کی جگہ بھس اور گھاس بھر دی گئی......''

میں نے کہا--''میرا نظریہ اس لحاظ سے غلط نہیں تھا کہ......افضل چور نہیں تھا بلکہ اُس کا کسی چیز کو حاصل کرنے کا طریقہ غلط تھا......اس لئے وہ چور کہلایا۔ لیکن اس نے پایا کچھ نہیں بلکہ گنوایا ہی اپنے......آخری لمحوں میں بھی---شرف الدین اور زینب نے بیٹے کو گنوایا' اُس کی بیوی نے اپنے شوہر کو اور بچوں نے ایک باپ کے سائے کو۔ اگرچہ وہ فقیر کی گدڑی کی طرح جگہ جگہ سے پھٹا اور بدحال تھا لیکن تھا ایک سایہ ہی......اب وہ سایہ انہیں کہاں سے ملے گا......''

ایک عورت ہی ان تمام جذبوں کو بہ خوبی سمجھ سکتی ہے چنانچہ......زہرہ پیالیاں اُٹھا کر باورچی خانے کی طرف جارہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور......میری انگلیوں میں دبا سگریٹ جو جلتے جلتے تقریباً ختم ہو چکا تھا......

تقسیم ضرب تقسیم

بقول شوکت تھانوی کے (افسانے میں) یہ سالے صاحب کی ضرب تقسیم ہے۔ یہاں تقسیم ضرب تقسیم زمین کی ہے' دلوں کی نہیں اور نہ ہی جذباتوں کی جو بانٹے نہیں بٹتے اور کاٹے نہیں کٹتے۔

سعادت اس بات کو تقریباً بھلا ہی چکا تھا کہ ہندوستان میں اس کے مرحوم ماں باپ کے دو گھر ہیں دو بھائی ہیں اور ایک بہن۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر اس لئے پاکستان اُٹھ آیا تھا کہ اس کی بیوی دردانہ اس بات پر مُصر تھی کہ اب ہندوستان میں کیا رکھا ہے۔ پاکستان اسلامی ملک ہے وہی ہمارا وطن ہوگا جہاں بچوں کا مستقبل سنور سکتا ہے۔

سعادت ہندوستان میں ایک گورنمنٹ کالج میں بہ حیثیت ایک لائبریرین کے تھا۔ ایک دن اس نے اپنی پاکستان منتقلی کی بات اپنے آفیسر کے سامنے کہی تھی اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد استعفیٰ بھی پیش کر دیا تھا تو اس آفیسر نے جو گرچہ ہندو تھا۔ سعادت کا استعفیٰ اسے لوٹاتے ہوئے سمجھایا تھا۔

آپ ضرور پاکستان جائیں مسٹر سعادت میں آپ کو روکوں گا نہیں۔ لیکن جذبات میں آ کر ہوش سے کام لیں' ریزائین کر کے نہ جائیں۔ وہاں جائیں اور دیکھیں اگر حالات سازگار ہوں تو پھر یہاں آ کر ریزائین کر جائیں۔ حالات سازگار نہ ہوں تو آپ ناحق ایک نئے ملک میں جا کر پریشان ہو جائیں گے۔

اس کا اندازہ تو سعادت کو اس وقت ہی ہو گیا تھا۔ جب وہ سرکاری نوکری کو چھوڑ کر اس ٹرین میں سوار ہو چکا تھا۔ مع اپنے بیوی بچوں کے جو پاکستان چلی جا رہی تھی۔ آج بھی اسے اچھی طرح یاد ہے کہ بارڈر کراس کرتے ہوئے ٹرین ایک اسٹیشن پر کچھ دیر کے لئے رُکی تھی تو وہ اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ ٹرین سے نیچے اتر پڑا تھا ایک جگ لے کر تا کہ اس میں نل سے پانی بھر لائے...... پھر جوں ہی وہ نل سے جگ میں پانی بھر کر پلٹا تو اسے اپنے چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آئی تھی جو بھیڑ میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بے تحاشہ رو رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ ایک لال کپڑوں والا آدمی اس کے ہاتھ سے پرس چھین کر اس بھیڑ میں گم ہو گیا ہے۔ لال کپڑوں والا آدمی قلی کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ اور وہ جس پرس کو لے اڑا تھا۔ اس میں سعادت کی ساری زندگی کا اثاثہ تھا۔ مع پاسپورٹ کے۔ حقیقت میں تو اس قلی نے پرس اڑا کر سعادت کی ساری زندگی پر اس طرح جھاڑو پھیر دی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ وہ پریشانی کے عالم میں اپنی عمر کا لحاظ کیئے بغیر ہی اسٹیشن پر رونے لگا تھا۔ اس کا ساتھ اس کی بیوی اور

دیگر بچے بھی دے رہے تھے جو ٹرین سے اتر گئے تھے۔ ان لوگوں کو اس طرح روتے دیکھ کر لوگوں کی ایک بھیڑ ان کے اطراف جمع ہو گئی تھی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ کسی نے ان کے بچے کے ہاتھ سے پرس کا صفایا کر دیا ہے اور اب ان کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے آگے جانے کے لئے تو یہ سب لوگ ہمدرد بن گئے تھے۔ اور سعادت کی مدد کرنے لگے تھے۔ سعادت دستی پھیلا کر ان کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ سب لوگ اپنی اپنی حیثیت سے روپے پیسے اس کی پھیلی ہوئی دستی میں ڈالتے چلے جا رہے تھے۔

پھر پاکستان پہنچنے کے بعد سعادت کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے کئی دنوں تک کوئی نوکری نہیں مل سکی تھی۔ وہ جو کچھ روپئے پیسے ساتھ لایا تھا وہ تو بارڈر کراس کرتے ہوئے اسٹیشن پر ہی لٹ چکے تھے۔ صرف وہ زیورات ہی کچھ دنوں اس کا ساتھ دے سکتے تھے جو اس کی بیوی کے جسم پر رہ گئے تھے۔ ان کو بیچ کر ایک مختصر سا گھر کرایہ پر لے کر بچے کچے پیسوں سے وہ سب اپنے پیٹوں کی آگ بجھا رہے تھے کہ یہ اثاثہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا اور نوبت فاقوں کی آنے لگی تھی کہ سعادت کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ اس نے ہندوستان چھوڑ کر کتنی غلطی کی ہے۔ تب ہی اس نے ہندوستان لوٹ جانے کے بارے میں فیصلہ کر لیا تھا اور گمشدہ پاسپورٹ کے بدلے نیا پاسپورٹ حاصل کرنے کی کارروائی بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن اس کو نیا پاسپورٹ کئی دنوں تک کئی دفتروں کے چکر کاٹنے کے بعد بھی نہ مل سکا تھا۔ تو پھر اُس نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا اور جی جان سے نوکری کی تلاش شروع کر دی تھی۔

آدمی چونکہ نہ صرف پڑھا لکھا تھا بلکہ گریجویٹ بھی اور ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سے بھی بہ خوبی واقف تھا اس لئے ایک بینک کے منیجر نے سارے حالات اس کی زبانی سننے کے بعد اس پر رحم کھا کر اسے اڑھائی سو روپئے پر نوکری کی پیش کش کر دی تھی جس کو اس نے فوراً قبول کر لی تھی۔

ان دنوں پاکستان کے بینک نیشنلائزڈ نہیں تھے وہ سب پرائیویٹ سکٹر کے تحت چلتے تھے۔ جہاں نوکریوں کے لئے بارگیننگ کرنی پڑتی تھی' کیونکہ وہ لوگ جو بینک کے کرتا دھرتا اور تقسیم کار ہوا کرتے تھے وہ ٹھیٹ کاروباری تھے اور کاروباری لہجے ہی میں بات کیا کرتے تھے ان کا مخصوص جملہ ہوا کرتا تھا'' دیکھو! بھیا سن لو کہ ہم اس جاب کے دو سو روپئے دیں گے' آپ بولو آپ کیا لیں گے'' ضرورت مند کہتا' بھائی صاحب دو سو روپئے تو بہت کم ہیں اڑھائی سو روپئے کر دو'...... تو وہ ذرا سوچتے تھے پھر کہتے تھے'' ٹھیک ہے آ جاؤ نوکری پر یا پھر کہتے'' بھیا! معاف کرنا ہم تو دو سو ہی دیں گے مرضی ہو تو آ جاؤ''

لیکن سعادت کو ایسی بارگیننگ نہیں کرنی پڑی تھی۔ بینک کے کرتا دھرتاؤوں نے اس کی حالت پر رحم کھا کر خود سے اڑھائی سو روپئے ماہانہ پر نوکری کی پیش کش کر دی تھی۔ جس کو سعادت نے فوراً قبول کر لی تھی۔ ہندوستان میں اس کو ماہانہ پانچ سو روپئے ملتے تھے۔ یہاں اڑھائی سو میں کیا خاک ہو سکتا تھا۔ یہ دن اس نے

بڑی مشکلوں سے گذارے تھے۔ اس طرح کے روز دوپہر میں وہ ٹفن کے نام پر چنے کھا کر پانی پی لیا کرتا تھا۔
ایسے سخت ترین حالات سے گذرتے گذرتے جب بینک نیشنلائیز ہو گئے تو اس کی تنخواہ بھی بڑھتے بڑھتے
ہزاروں تک پہنچ گئی اور اسے آفیسر کا پوسٹ بھی مل گیا۔ ساتھ ہی کچھ سالوں کے اندر اندر اس کی زندگی میں
ایک ایسا عظیم انقلاب آ گیا کہ اس نے خود کو بدل دیا' چونکہ وہ معاشی طور پر کافی مستحکم ہو چکا تھا۔ اب اسے کسی
قسم کی کوئی پریشانی لاحق نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی' دو بچوں کو باہر بھجوا دیا۔

اتنا سب کرنے کے بعد اب سعادت کی زندگی کا واحد مقصد صرف یہ رہ گیا تھا کہ ایک اچھا سا بنگلہ
جو ہر اقسام کی ضروریات سے آراستہ ہو بنگلے پر ٹیلی فون ہو اور ایک عدد کار بھی ہو۔ ان سب کے حصول کے
لئے سعادت کو کوئی پریشانی نہیں اُٹھانی پڑی تھی چونکہ بینک اس کے حق میں علاؤ الدین کا جادوئی چراغ
ثابت ہوا تھا۔ جس نے آسان اقساط پر ایک بڑی رقم مہیا کر دی تھی۔ لیکن اس عیش و عشرت کی بدولت اس
کی تنخواہ جو بڑھتے بڑھتے چار ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ وہ ہر ماہ بینک کے قرضے جات میں کٹ کٹا کر اڑھائی
ہزار روپئے تک رہ گئی۔

بچے چونکہ بڑے ہو چکے تھے اور دونوں ہی باہر جا چکے تھے۔ دونوں بچیوں کی بھی شادیاں ہو چکی تھیں
اس لئے یہ تنخواہ کم تو نہیں تھی۔ لیکن اس میں ان کا گذارا مشکل سے ہو پا رہا تھا۔ چونکہ اس میں پڑول کا خرچ
' کار کی دیکھ بھال کے علاوہ ٹیلی فون کا بل بھی شامل تھا کم بھرتی میں آفیسری کی ٹھاٹ باٹ کو قائم رکھنا بھی
سعادت کے لئے ضروری تھا جس میں اسے روز چار پیکٹ سگریٹ کے پھونکنا پڑتے تھے اور دن میں کئی
مرتبہ ٹھنڈی بوتلیں کوکا کولا کی بھی پینا پڑتی تھیں جس کو سعادت نے اپنا معمول بنا رکھا تھا۔

سعادت کی بیوی دردانہ اس کی ایسی ٹھاٹ باٹ کی زندگی سے عاجز آ چکی تھی کیونکہ ہر مہینے کے آخر
دنوں میں ہاتھ بے حد تنگ ہو جایا کرتا تھا۔ باہر سے بچے جو کچھ پس انداز کر کے بھجواتے وہ بھی گھر کے خرچ
کی نذر ہو جاتا کرتا تھا۔ بچوں کی ہدایت تھی کہ جو کچھ وہ بھجوا رہے ہیں اس کو جمع کر کے جلدی سے بینک کا قرض
نکال دیا جائے تا کہ ساری کی ساری تنخواہ گھر آ جائے اور زندگی چین و سکون سے گذر سکے۔ لیکن سعادت کا
خیال یہ تھا کہ اس شاہانہ زندگی جس کو وہ شروع کر چکا ہے اس میں کمی نہیں ہوگی۔ اگر کمی ہوگی تو اس کی وقعت
بینک میں گھٹ جائے گی۔ اس کا خیال یہ بھی تھا کہ سگریٹ ہاتھ میں سلگتا رہے اور ٹیبل پر کوکا کولا کی بوتلیں رکھی
ہوں تو اس سے دوسروں پر کافی رعب پڑتا ہے۔ لیکن دردانہ چاہتی تھی کہ خرچ کم ہو اور جلد سے جلد بینک کا
قرضہ ادا ہو جائے...... لیکن یہ ہوگا کیسے اس بارے میں وہ ہمیشہ سوچتی رہتی تھی۔

ایک دن اسی طرح سوچ میں غرق تھی کہ اسے ایک آسان سی ترکیب سوجھ گئی وہ فوراً اٹھی اور اپنے شوہر
سے جو بینک سے آنے کے بعد ہاتھ میں کوکا کولا کی بوتل پکڑے آرام سے صوفے پر نیم دراز تھا اور دھیرے

دھیرے بوتل سے مشروب سپ کررہا تھا' بولی۔ ''سنو جی! بینک کا قرضہ کیسے جلدی ادا ہو۔ اس کی ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ مجھے آج ہی سوجھ گئی ہے'' کہتے ہوئے وہ غور سے سعادت کی صورت تکنے لگی......

سعادت نے جھلا کر کوکولا کی بوتل فوراً نیچے رکھ دی اور تیز لہجے میں بولا۔ ''ہاں! مجھے معلوم ہے تم یہی کہو گی نہ کہ میں اپنا خرچ کم کردوں سگریٹ پینا چھوڑ دوں۔ ٹھنڈی بوتلیں پینا چھوڑ دوں۔ کار بیچ دوں اور ٹیلی فون کٹا دوں''۔

''نہیں یہ سب کچھ نہ ہوگا'' دردانہ نے صوفے پر اس کے بازو میں بیٹھتے ہوئے اس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔

''پھر!'' سعادت نے اسی طرح جھلاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے یہ بتلاؤ کہ تم کو بینک سے چھٹی کا کتنا حق ہے۔''

''لیکن ان چھٹیوں کی تنخواہ مجھے نہیں ملے گی ہاں میں انہیں لے ضرور سکتا ہوں''۔

''تمہیں چھٹیاں ہی لینی ہیں جان من ہندوستان جانے کیلئے'' وہ چہکی'' جہاں تمہارے ماں باپ کے دو مکان ہیں۔ ماں باپ تو گذر چکے ہیں لیکن ان مکانات میں تمہارا حصہ ہے تم قانونی طور پر نہ سہی شریعت کے لحاظ سے تو اس کے حق دار ہو''۔

سعادت جو اس بات کو تقریباً بھلا ہی چکا تھا دردانہ کی بانہوں کو اپنے گلے سے نکال دیا اور غور سے اس کی صورت تکنے لگا...... ''لیکن...... تمہارا مطلب یہی ہے کہ میں ہندوستان جاؤں اور وہاں جا کر بھائیوں سے اپنا حق طلب کروں...... کیوں یہی کہنا چاہتی ہو نہ تم''۔

''ہاں: یہی...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے دونوں بھائی وہاں ایک ایک مکان پر قابض ہوگئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی بہن کا حصہ دے دیا ہے اور تمہارا حصہ انہوں نے الگ دس دس ہزار ہر ایک مکان سے نکالا ہے۔ اس وقت کے حساب سے جب انہوں نے مکانات کی قیمت اٹھوا کر بہن کا حصہ اور تمہارا حصہ نکالا تھا' آج سے دس سال پہلے۔ لیکن اسے تم تک پہنچایا نہیں۔ اب جانتے ہو ان مکانوں کی قیمت کیا ہوگئی ہے۔ ایک ایک مکان دو دو لاکھ سے کم کا نہیں اس لحاظ سے تمہارا حصہ کتنا نکلا ہے اس کا حساب خود ہی کرلو''۔

سعادت بینک میں چونکہ اکاؤنٹ کا ماہر مانا جاتا ہے اس لئے دل ہی میں اس نے حساب جوڑا تو اس کی آنکھیں کھی کی کھلی رہ گئیں اور وہ حیرت سے دردانہ کی صورت تکنے لگا......

دردانہ ہنس پڑی......

''اس طرح میری صورت کیا تک رہے ہو ڈارلنگ' آج ہی خط لکھ دو۔ اپنے بھائیوں کو اور بتلا دو کہ تم ان مکانات میں برابر کے حصے دار ہو اور لکھ دو کہ تم عنقریب ہی ہندوستان آرہے ہو اپنے حصہ کے لئے۔

سعادت نے فوراً نئے پیکٹ سے نئی سگریٹ نکالی اور اسے منہ میں دبا کر جلانے کے بعد کش اپنے

اندر کھینچا اور سوچ میں غرق ہو گیا۔

ساری رات وہ خط لکھنے کے بارے میں ہی غور کرتا رہا کہ کیسے اور کس طرح لکھا جائے خط اور خط کا مضمون کیسا ہو۔ وہ بھائیوں کو کس طرح مخاطب کرے۔ خیالات ہی خیالات میں وہ دماغ میں کتنے ہی کاغذ لکھ کر پھاڑ چکا تھا۔ صبح اٹھا تو وہ کافی مضمحل تھا۔

ضرورت اور ناشتے سے فارغ ہو کر بینک جانے سے پہلے اس نے دردانہ کو آواز دی۔

دردانہ نے قریب آ کر پوچھا ''کیا ہے۔''

دیکھو! میں نے خط لکھنے کے بارے میں ساری رات غور کیا مری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ میں کس طرح خط لکھوں اور کیا لکھوں۔ میں شاید اس بارے میں خط لکھ بھی نہیں سکوں گا''۔ کہتے ہوئے ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ''اب تم ایسا کرو کہ تم خط لکھ دو۔ میں اس پر دستخط کر دوں گا اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اس خط کے مضمون کو پڑھوں گا بھی نہیں۔''

''اوہو! اور میں چاہے اس خط میں کچھ بھی لکھ دوں'' دردانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ یہ لکھ دوں کہ یہ تم لوگوں نے اچھا کیا جو ماں باپ کے مکانات نہ بیچ کر اپنے نام کرالیا اور میرا حصہ دبالیا۔ لیکن میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں تم ہمیشہ خوش رہو۔ یہی میری تمنا ہے''۔

''لیکن مجھے یقین ہے تم ایسا نہیں لکھو گی''۔ سعادت ہنس پڑا ''کیوں کہ تمہیں میرے بینک کے قرضے کی فکر لگی رہتی ہے کہ وہ کب ختم ہوگا اور کب پوری تنخواہ گھر کو آئے گی''۔

دردانہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! اسی کو کہتے ہیں نیکی کر اور دریا میں ڈال'' ...... پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ٹھیک ہے میں لکھ دوں گی خط۔ لیکن تم کو بتلاؤں گی نہیں'' کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔

دوسرے دن سعادت نے بینک جانے سے پہلے دردانہ کو بلایا اور ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم نے وہ خط لکھا دیا ہے جان من......

دردانہ جو ساری رات سو نہیں سکی تھی، تھکے تھکے لہجہ میں بولی۔

''ساری رات میں بھی تمہاری طرح پریشان اور سوچتی رہی کہ خط کس طرح شروع کروں۔ کیا لکھوں اس میں وہ میری سمجھ میں نہ آیا...... جب بھی میں خط لکھنے بیٹھ جاتی یہ سوال میرے ذہن پر ہتھوڑے برساتا رہا کہ کئی سالوں تک کیا کیا ہے ہم نے ان مکانات کے تعلق سے کیا ہم نے کبھی ان مکانات کو پوچھ کر بھی دیکھا ہے کیا ہم نے کبھی اس کی ترمیم اور جھڑا پڑا بنوایا ہے یا بنوانے کے لئے پیسے بھجوائے ہیں۔ پھر تمہارے بادا کی تیمارداری میں جب کہ وہ کئی سالوں تک فالج کے مریض رہے اور بستر پر پڑے رہے تھے۔ ہم نے ان کی کیا خدمت کی؟...... ہم ان کو دیکھنے تک بھی نہ گئے تھے۔ اور اب حق طلب کرتے ہوئے۔ زبان تو

زبان ہاتھ بھی نہیں اٹھ رہے ہیں''۔

سعادت حیرت سے دردانہ کی طرف دیکھنے لگا...... ''کہیں تم بہک تو نہیں گئی ہو'' وہ بولا۔

''کچھ دنوں پہلے تمہارے بھائیوں کے پاس سے ایک خط آیا تھا''۔ دردانہ اس کی بات کو نظر انداز کردی ''جس میں انہوں نے مکانوں کے حصے کا ذکر کیا تھا کہ اسے آکر ہم لے جائیں.......... جس کو انہوں نے بینک میں سنبھال کر رکھا ہے۔ لیکن میں نے اس خط کا ذکر تمہارے سامنے نہ کیا تھا۔ کیوں کہ وہ رقم مجھے بہت کم لگی تھی...... لیکن اب لگتا ہے وہ رقم جو انہوں نے نیک نیتی سے سنبھال رکھی ہے وہ ہمارے لئے بہت زیادہ ہے ہم کو اسے فوراً قبول کر لینا چاہیئے''۔

سعادت جو بینک جانے کیلئے تیار کھڑا تھا۔ دردانہ کی اس دلیل پر حیرت سے صوفے پر بیٹھ گیا...... پھر کچھ سوچتے ہوئے جیب سے سگریٹ کا نیا پیکٹ نکالا۔ اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اسے ہونٹوں میں دبالیا۔ اور لائٹر سے اس کے دوسرے سرے کو جلا کر ایک لمبا کش اپنے اندر کھینچا اور پھر تھوڑی دیر تک خلاء میں گھورتے رہنے کے بعد اپنا سر ہلایا۔ ''ہاں! لیکن۔ لیکن۔۔ ہاں مجھے بھی ایک نئی تجویز سوجھی ہے۔ وہ یہ کہ کیوں نہ ہم اپنی رقم کو قبول نہ کرتے ہوئے ایسی ہدایت دیں کہ وہ اس رقم کو کسی بھی بینک میں ایک لمبے عرصے کے لئے فکسڈ ڈپازٹ کرا ڈالیں۔

کم از کم پانچ سال کیلئے...... اور پھر اُس رقم سے جو ختم مدت پر انٹرسٹ کی صورت میں ملے گی اس سے غریبوں کی مدد کرتے رہیں اس کے بعد اصل رقم کو پھر مزید پانچ سالوں کے لئے فکسڈ کرا ڈالیں اس طرح ہر پانچ سال بعد یہی عمل کرتے رہیں اس سے ہوگا یہ کہ ہمارا رشتہ ہندوستان سے ٹوٹے گا نہیں ۔ کیوں کہ ہندوستان میں ہمارے مکان ہیں۔ جس میں ہم برابر کے حصہ دار ہیں اگر ہم اپنا حصہ لے لیں تو ذہنی طور پر ہمارا رشتہ ہندوستان سے ٹوٹ جائے گا۔ اس زمین سے جہاں ہمارے مکان ہیں جہاں ہمارا وطن ہے''۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے خلاء میں گھورتے ہوئے پھر بولنا شروع کیا...... سچ تو یہ ہے دردانہ کہ ہم تقسیم کے بعد پاکستان یہ سمجھ کر آئے تھے کہ ہمارا اسلامی ملک ہے۔ یہی ہمارا وطن ہوگا...... لیکن ہوا کیا؟...... ہم یہاں سالوں سے رہنے کے باوجود مہاجر کہلا رہے ہیں۔ صرف مہاجر...... کیسی ہے یہ تقسیم؟...... کہاں ہے ہمارا وطن؟...... بولو؟...... سعادت نے اپنے چہرے کے اطراف پھیلے سگریٹ کے دھوئیں میں خود سے سوال کیا...... یہ سوال کرتے ہوئے اس کا گلہ روندھ گیا تھا......

دردانہ جو خاموش کھڑی ہوئی تھی فوراً اس کے بازو میں صوفے پر بیٹھ گئی اور اس کے کندھے پر اپنا سر لگائے اداس ہوگئی...... اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئی تھیں اور یہ آنسو اس کی گھنیری پلکوں کے چھایا تلے آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔

❋❋

خلاء

جہاں کوئی وجود نہ ہو وہ خلاء ہے۔ لیکن اس خلاء میں طلسمی طاقتوں کا شبہ ہو جائے تو دل میں ڈر اور خوف از خود بس جاتا ہے چاہیے وہاں کوئی کچھ نہ ہو لیکن نظر آتا ہے کہ وہاں کچھ ہے۔

سَن کا خیال مجھے کبھی نہیں رہتا۔ ہاں یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے جب ہم ابھی بچے تھے اور اسکول جایا کرتے تھے۔ ہر سال کے ابتدائی کم و بیش سہ ماہ گذر جانے کے بعد جب گرما کے موسم کی آمد آمد شروع ہو جاتی اور اسکولوں کی چھٹیاں تو اس وقت ہم سب اپنے چھوٹے سے گنجان آبادی والے گھر سے اٹھ کر خالہ' خالو کے یہاں چلے جایا کرتے تھے۔ اس لئے کہ خالہ کا گھر کافی بڑا ہوادار اندرونِ عملی آباد دروازے کے ایک نواحی علاقے میں واقع تھا...... اس کا صحن اتنا بڑا تھا کہ اس میں بے شمار درخت جام' جامن' آم سے لے کر شہتوت تک کے تھے۔ اور ان درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں جو ہوا کے زور سے قدرتی پنکھوں کی طرح ہلتے رہتے تھے۔ گرما کا موسم بڑی آسانی سے کٹ جایا کرتا تھا۔

اس گھر کا قدیم چوبی دروازہ اتنا اونچا اور بڑا تھا کہ ایک پورے قد کا بڑا ہاتھی با آسانی اس میں سے کھڑے کھڑے گذر سکتا تھا۔ اس دروازے میں گھستے ہی بائیں ہاتھ پر ایک مطب تھا۔ لیکن یہ وہ مطب نہیں تھا جس میں کوئی حکیم بیٹھا ہوا مریضوں کی نبض دیکھ کر نسخے تجویز کیا کرتا ہے۔ بلکہ یہاں کسی زمانے میں ملا بیٹھے رہتے تھے جو ان مریضوں کا علاج کیا کرتے تھے جن پر شیطان وارد ہو جاتے ہیں...... اب وہاں نہ تو کوئی ملا ہے نہ مریض بلکہ مطب کے بیچ صحن میں کھڑا نیم کا ایک قدیم پیڑ ہے جس کے پتے اکھڑ کر یوں ہی بلا ضرورت گرتے رہتے ہیں۔ جس طرح قصہ حاتم طائی میں تالاب کے کنارے کھڑے بوڑھے برگد کی ہر شاخ سے لٹکے سر رات کی تاریکیوں میں گر کر تالاب میں اپنے جسموں سے ملتے رہتے ہیں اور پھر پو پھٹتے ہی اپنے جسموں سے علیحدہ ہو کر شاخوں سے جا لٹکتے ہیں یہاں مطب میں اگر کسی کی آنکھیں انہونے واقعات دیکھنے کی عادی ہوں تو انہیں یہاں بھی نیم کی ہر شاخ پر کچھ عجیب و غریب سر لٹکے ہوئے ضرور دیکھائی دیں گے لیکن مجھے تو مطلب کے طاقچے میں رکھا وہ سر ہمیشہ دیکھائی دیتا جس کے سر پر بال نہیں تھے بلکہ سر بڑا چکنا تھا۔ جیسے اس پر بال تھے ہی نہیں۔ اور اس کی آنکھیں بھی نہیں تھیں۔ آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے سوراخ تھے۔ منہ تو

ہونٹوں سے بالکل بے نیاز اور دانت پورے غائب ...... دراصل وہ ایک ایسی کھوپڑی تھی جو معلوم نہیں کس شیطان کی تھی جو ملاؤں کے ہاتھ لگی تھی۔ یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ملا نے کسی مریض کے علاج کے دوران شیطان کو اپنے قبضے میں لے کر اسے مار ڈالا ہو، اور اس کو جلا کر کھوپڑی حاصل کر لی ہو، کیونکہ کھوپڑی کے ساتھ کچھ دیگر چھوٹی بڑی ہڈیاں بھی تھیں۔ جیسے ہاتھ پیر کی۔ بحرحال کچھ بھی ہو یہ سب کچھ دیکھ کر مجھ پر ہمیشہ ایک قسم کی وحشت طاری ہو جایا کرتی تھی، اس گھر سے، اس مطب سے، اس کھوپڑی سے۔

درحقیقت اس گھر میں خالو ہی سب سے بڑے شیطان تھے۔ میرا مطلب کہنے کا یہ نہیں ہے کہ وہ سچ مچ کے شیطان تھے بلکہ فطرتاً شیطان واقع ہوئے تھے جو عورتوں پر وارد ہو جاتے ہیں۔ یعنی کہ وہ جنسی طور پر اتنے تیز تھے کہ عورت خور کہلاتے تھے گھر سے باہر رہ کر ہر رات وہ دو چار عورتوں کو با آسانی ہضم کر جایا کرتے تھے۔ ہماری خالہ، خالو صاحب کی اس فطرت سے ہمیشہ خار کھائے رہتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ان کی یہ فطرت چھوٹ جائے۔ اس کے لئے انہیں کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑے تھے۔ اس کی بڑی تفصیل ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ہر روز صبح اٹھ کر فجر کی نماز سے پہلے نل کے پاس ہاتھ میں خنجر لئے بیٹھ جاتیں تھیں اور خنجر کو پانی کی دھار کے نیچے رکھ کر اس صراحی میں وہ پانی بھرتیں تھیں جو خنجر پر پڑ کر اس کی تیز دھار سے گزرتا ہوا صراحی میں گرتا تھا اور وہ اس پانی کو خالو کو ہی پلایا کرتی تھیں۔ دوسرے ان کے یہاں سفید پورسیلین کانچ کی بے شمار چھوٹی بڑی طشتریاں تھیں۔ جن پر کالی سیاہی سے کچھ عربی آیات لکھی ہوتی تھیں۔ وہ ان آیات کو بھی خالو کی نظریں بچا کر بڑی آسانی سے اس صراحی کے پانی میں گھول کر انہیں پلا دیا کرتی تھیں، جو شہر کے مشہور ملاؤں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہوتیں کہ خالو اندرونی طور پر درست ہو جائیں اور عورتوں کا پیچھا چھوڑ دیں۔ لیکن معلوم نہیں خالو پر اس کا الٹا اثر کیوں ہوتا تھا کہ آئے دن ان کی راتوں میں عورتوں کا اضافہ ہی ہوتا رہا...... جب تک وہ چار مینار پولیس تھانے میں بطور جمعدار برسر روزگار رہے۔ پنچ محلہ کی ایک پاڑدن کو جو ٹھیلے پر طرح طرح کے میوے سجائے رہتی تھی وہیں ایک کمرہ لے کر اس کو ڈالے رہے، جو ان کی اتنی پسندیدہ عورت تھی کہ اس کی تصویر کو انہوں نے اپنے گھر کی دیوار پر فریم میں اس طرح لگا رکھا تھا کہ خود کی تصویر بیچ میں تھی اور اطراف اس پاڑدن کی کئی چھوٹی بڑی تصویریں تھیں جو تاروں کی طرح قالو کی بڑی تصویر کو گھیرے ہوئے رہتیں۔

جیسا کہ پہلے میں نے بتلایا ہے کہ ہم اکثر خالہ کے یہاں ان ہی دنوں جا کر رہا کرتے تھے۔ جب ہمارے اسکول میں گرمائی چھٹیاں ہو جاتی تھیں۔ اور ہم سارا گرما وہیں گزارتے تھے۔ والد صاحب کو یہاں کا پرسکون ماحول بے حد پسند آتا تھا جو شہر کی گہما گہمیوں سے الگ تھلگ تھا۔ پھر یہاں ٹرین سے عثمانیہ یونیورسٹی پہنچنے کے لئے جہاں والد صاحب بطور محاسب کارگزار تھے، اپوگوڑہ ریلوے اسٹیشن زیادہ دور بھی

نہیں تھا۔ شہر سے تو وہ سائیکل پر چھ سات میل کا طویل راستہ طے کر کے یونیورسٹی پہنچتے تھے یہاں سے ریل کے ذریعہ آرام سے پہنچ جایا کرتے تھے۔

والدہ صاحبہ تو نہایت گھریلو قسم کی عورت تھیں جو ہمیشہ سر سجدے میں جھکائے رہتیں، جبکہ خالہ کا زیادہ تر وقت خالو صاحب کو اپنے بس میں کرنے کی تدبیروں میں لگا رہتا تھا...... خالہ کو ہمارا ان کے یہاں رہنا اس لئے بھی زیادہ پسند تھا کہ ہم جب تک وہاں رہتے، خالو صاحب، والد صاحب کی صحبت میں ان تمام غیر ضروری عادتوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے جو عورتوں سے متعلق تھیں کیونکہ وہ سرے شام ہی بڑی پابندی سے گھر لوٹ آیا کرتے تھے۔ اس لئے بھی شاید گھر میں کوئی ہنگامہ ان دنوں خالہ کی طرف سے بپا نہیں ہوتا تھا صرف جلسوں کے سوا جس میں خالو اپنے جیسے ہی دوستوں کو ساتھ لے کر گھر میں سیندھی کے مٹکے کے مٹکے لڑھکایا کرتے تھے۔ اس وقت ہم سب معہ والدہ اور خالہ کے ان جلسوں سے دور مطب میں جا کر گھنٹوں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ مجھے وہاں مطلب میں بیٹھے ہوئے بڑا ڈر لگتا تھا خصوصاً اس کھوپڑی سے جو طاقچے میں رکھی رہتی تھی اور اس جھاڑ سے جس کے پتے ان دیکھی قوت کے تحت آہستہ آہستہ گر رہے ہوتے۔ اگر مجھ میں انہونے واقعات کو دیکھنے کی صلاحیت ہوتی تو مجھے اس جھاڑ کی ہر ایک شاخ پر عجیب و غریب لٹکے ہوئے سر ضرور دکھلائی دیتے جن کی صورتیں اتنی بھیانک ہوتیں کہ میرے منہ سے چیخیں نکل جاتیں۔ لیکن خالہ کا وہ شیطان بچہ جس کا ذکر شاید میں نے پہلے نہیں کیا ہے۔ بڑا شیطان تھا۔ وہ اکیلا ہی ہم لوگوں کے سامنے مطب میں جا کر اس ناہنجار کھوپڑی کی آنکھوں میں دونوں انگلیاں ڈال کر کھوپڑی کو اٹھا کر اس کو چوم لیا کرتا تھا تو ہماری آنکھیں دہشت سے پھٹی رہ جاتی تھیں۔ اس شیطان بچے کو خالو اپنے ساتھ رکھ کر جن کا وہ آخیر تک اکلوتا لڑکا رہا اسے بھی دو گلاس سیندھی کے پلا دیا کرتے تھے۔

اس عجیب و غریب گھر میں دن تو بڑی آسانی سے کٹ جایا کرتے تھے لیکن راتیں یوں آتیں جیسے کوئی ان دیکھی ہستی اپنا سیاہ لبادہ ہم سب پر اڑھائے اپنی بڑی بڑی چمکتی آنکھوں سے جو لال انگارے کی طرح دہک رہی ہیں ہم کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں...... ساری رات اسی وحشت میں گزر جاتی تھی اور دن نکل آتا تو دل پر سے ساری وحشت پلک جھپکتے چھٹ جاتی۔ پھر ہم تمام بچے جن میں میرے بھائی بھی شامل ہوتے اور خالہ کا وہ شیطان بچہ بھی ہاتھوں میں بڑی بڑی چھڑیاں لئے قازوں کے ایک منڈے کو ہنکا کر کھیتوں میں لے جاتے جو اس کے پچھواڑے قدیم قبرستان سے لگ کر تھا۔

خالہ کو جانے کیوں قازوں سے اتنی انسیت تھی کہ قریب قریب دو درجن قاز ہمیشہ اپنی لانبی لانبی گردنیں اور زیادہ لانبی کر کے شور مچاتے رہتے تھے۔ پو پھٹتے ہی وہ سب قائیں قائیں کی آوازیں لگانا شروع کر دیتے

تھے کہ سارا گھران آوازوں کے شور سے گھبرا کر جاگ اٹھتا تھا' تو پہلے ہم سب بچوں کو قازوں کے ساتھ ہاتھوں میں بڑی بڑی جھڑیاں دے کر باہر بھگا دیا جاتا تھا کہ دور کھیتوں میں لے جا کر انہیں پھرلائیں۔

جیسا کہ پہلے میں نے بتلایا ہے کہ اس گھر کا صحن کافی بڑا تھا جہاں ہمہ اقسام کے درخت تھے' آم' جام' جامن سے لے کر شہتوت تک کے جہاں سے اکثر بچھو نکلا کرتے تھے جب کبھی میرے چھوٹے بھائی کا پیر اتفاق سے ان پر پڑ جاتا' جب ہم وہاں کھیل رہے ہوتے تو وہ تلملا کر روتا اور چیختا۔ اماں کانٹا چبا۔ مجھے کبھی بچھو نے کاٹا نہیں یا پھر اتفاق سے میرا پیر ان پر پڑا نہیں۔ بحر حال ان درختوں کے بیچ صحن میں ایک بڑا سا حوض بھی تھا۔ جس کو لبا لب بھر کر ہم سب اپنے کپڑوں کے ساتھ اپنے پاجامے بھی اتار دیا کرتے تھے' پھر مادرزاد برہنہ حوض میں جھلانگیں لگا لگا کر خوب تیرا کرتے تھے کیونکہ خالو صاحب کی ہدایت تھی کہ تیرنا ہے تو ننگے ہی تیرنا چاہیے مزہ اسی میں آتا ہے۔ ممکن ہے اگر خالو صاحب کا بس چلتا تو وہ بھی اپنے کپڑے اتار کر ہم میں شامل ہو جاتے ان کی فطرت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ بچوں میں بچے اور بڑوں میں بڑے بن جایا کرتے تھے مجھے یاد ہے اکثر جب ہم سب بچے ایک دوسرے کے پیچھے ایک دوسرے کے کرتے پکڑے آگے آگے چلتے ہوئے ریل کا کھیل' کھیل رہے ہوتے تو خالو بچوں کی طرح پیچ تیجم تیجم جسم کو لئے ہمارے بیچ آکودتے اگر چہ وہ ڈریس پہنے ہوئے ہوتے اور تھانہ جانے کے لئے تیار' لیکن وہ ہمارے قریب آ کر بولتے۔ چلو تم سب میرے پیچھے آجاؤ۔ میں انجن بنتا ہوں اور تم سب ڈبے...... پھر وہ انجن بن جاتے اور اپنے دونوں بھاری بھر کم ہاتھوں کو زور زور سے اُوپر ہلا ہلا کر جیسے کوئی نوسیکھ ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے کی مشق کر رہا ہے چھک چھک کرتے ہوئے ہم سب ڈبوں کو کھینچتے تو سبھی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ان کی ایسی فطرت پر اب خیال آتا ہے کہ ان کی اسی سادہ لوحی نے ان کی طرف سے عورتوں کے ساتھ کھیلے گئے ان کھیلوں پر بھی جو ناشائستہ ہوتے اسی طرح کا پردہ ڈال رکھا ہوگا۔

خیر اس بحث میں نہ پڑتے ہوئے میں اتنا ضرور بتلاؤں گا کہ خالو صاحب' والد صاحب سے بڑے کھل کر باتیں کیا کرتے تھے والد صاحب بھی اکثر ہنس کر ان کی غیر ضروری باتوں کا ہوں' ہاں! میں جواب دے دیا کرتے تھے۔ اس وقت تو ہم سب بڑی زور سے کھل بول کر ہنس دیا کرتے تھے' جب خالو صاب' والد صاحب سے پوچھتے۔ کیا محاسب صاحب! اجازت ہے۔ ہاں! اجازت ہے! پر اتنی زور کی آواز پیدا ہوتی جیسے ایک ساتھ کئی لاریوں کے ٹائیر برسٹ ہو گئے ہوں۔

والدہ تو اس وقت منہ پھیر کر ہنس کر خاموش ہو جایا کرتیں لیکن خالہ گھور کر خالو صاحب کو یوں دیکھتیں جیسے انہیں وہاں پیوند لگا کر ہی دم لیں گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خالو صاحب' خالہ کی بہت سی باتوں کو ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک خالہ قابل رحم تھیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ وہ کتنے خالہ کے ہو کر رہ رہے ہیں اور کتنے غیر عورتوں کے۔ اس کے باوجود خالہ کو جانے کیوں قازیں پالنے کے علاوہ اس کی کیا عادت تھی کہ محلے کی ہر جوان عورت کو وہ اپنے یہاں گھنٹوں بیٹھالیا کرتی تھیں۔ جوان کے یہاں بیٹھ کر گھنٹوں منطقیں مارتی رہتی تھیں چاہیے خالو گھر میں ہوں یا باہر ڈیوٹی پر--- ہماری والدہ کو یہ کبھی اچھا نہیں لگا کہ جوان عورتیں یوں گھر میں بے دھڑک گھس کر بیٹھا کریں اور اِدھر اُدھر کی غیر ضروری باتیں کریں...... چنانچہ بعد میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر آگے آئے گا کہ ان عورتوں میں ایک اختری بھی تھی' جس پر خالو صاحب بری طرح مرمٹے تھے' جو بمبئی کی رہنے والی تھی اور وہاں اپنے شوہر کو چھوڑ آئی تھی' اس لئے کہ اس کا شوہر اس کے اپنے حساب سے اس کے حق میں ناکارہ تھا۔

بحر حال جب تک ہم وہاں رہتے' دن بڑے مزے سے کٹ جایا کرتے تھے.......... ان دنوں کی کئی باتوں میں سے ایک بات مجھے آج بھی یاد ہے کہ علی آباد کے ایک چھوٹے سے موضع اپوگوڑہ میں ایک ڈیڑہ تھیٹر لگی تھی۔ اس زمانے میں گاؤں کھیڑوں میں کوئی باقاعدہ تھیٹر نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ڈیرے میں ہی پروجیکٹر لگا کر پیچھے کرسیاں ڈال کر آگے شطرنجیاں بچھا دی جاتی تھیں۔ کرسیوں پر معزز حضرات بیٹھتے تھے یا پھر وہ جن کی جیبیں گرم رہتیں اور نیچے شطرنجیوں پر عوام چونکہ خالو صاحب تھانے میں تھے اس لئے ہم سب فری معہ اپنے پالتو کتے موتی کے تھیٹر میں بیٹھے تھے کرسیوں پر--- اس وقت جو پکچر چل رہی تھی اس میں ''پکار'' تھی جہانگیر اور نور جہاں کے درمیان محبت کی ازلی داستان مجھے اس فلم کے کچھ ہی سین یاد رہ گئے ہیں جو میں نے وہاں دیکھے تھے۔ ایک سین وہ جب محل کی ساری گھنٹیاں بج رہی تھیں' دوسرا سین وہ جس میں ایک عورت جو بڑی خوبصورت تھی اور اچھے زرتار کے کپڑے پہنے ہوئے' بڑی مشکل سے جو کی روٹی بھاجی کے ساتھ پانی کے گھونٹوں کے ساتھ نگلنے کی کوشش کر رہی تھی' چوتھا سین غالباً کہیں بیچ میں تھا کہ ایک مرد جو خود بھی زرتار کے کپڑے پہنا تھا وہی عورت کو جو بڑی خوبصورت تھی کبوتروں کی ایک جوڑی لاکر اسے دیتا ہے--- وہ عورت ان کبوتروں کو یکے بعد دیگرے اڑا دیتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ اس کے بعد پکچر ختم ہوئی اور ہم سب وہاں سے گھر پیدل ہی لوٹ رہے تھے تو رات بہت زیادہ بیت چکی تھی' پھر گھر کا راستہ یہاں سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں تھا اس لئے خالو صاحب نے مجھے کندھے پر بٹھالیا تھا کیونکہ اندھیرے میں میرے پیر میں ایک کانٹا چبھ گیا تھا۔

اس کے دوسرے دن مجھے یاد ہے' خالو صاحب کا وہ شیطان بچہ جو مجھ سے عمر میں کافی بڑا تھا اس خوبصورت عورت کی یاد میں جس کو اس نے رات پکچر میں دیکھا تھا آہیں بھر رہا تھا تو میری سمجھ میں نہ آسکا تھا

کہ اس کی ایسی حالت کیوں ہوگئی ہے۔

بعد میں، میں یہ جان گیا تھا دراصل یہ بات مجھے اسی شیطانی بچے نے بتلائی تھی کہ ہر عورت میں ایک کشش ہوتی ہے کہ وہ مقناطیس کی طرح مرد کو اپنی طرف کھینچ لے، شرط یہ ہے کہ کھینچی جانے والی چیز لوہا ہونا چاہیے۔ اور کھینچنے والی چیز مقناطیس...... اس طرح مجھے مقناطیس اور لوہے کا سمبندھ معلوم ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ خالو صاحب ایسا بھاری لوہا ہیں جن کو کھینچنا ایک معمولی مقناطیس کے بس کی بات نہیں۔ ان کو کھینچنے کے لئے لگاتار دو چار مقناطیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات خالہ کے ذہن میں کس طرح سما سکتی تھی۔
اس لئے آئے دن خالہ اور خالو میں جھگڑے کی نوبت آتی رہتی تھی۔ کبھی جھگڑے کی نوعیت اتنی شدید ہو جاتی کہ خالہ کے بلانے پر ہم سب گرما کے علاوہ بھی ان کے یہاں چلے جایا کرتے تھے۔ والدہ صاحبہ خالہ کو سمجھاتیں کہ اب چھوڑو بھی ان قصوں کو وہ تمہیں بھی چاہتا ہے اور زیادہ ہی چاہتا ہے یہی غنیمت جانو......
والد صاحب بھلا اس میں کیا دخل دیتے خاموش ہو جایا کرتے تھے کہ تم عورتوں کی باتیں تم ہی جانو...... اس کے باوجود وہ چیخ چیخ چلتی دونوں میاں بیوی میں کہ خالو صاحب جو ہم لوگوں کا زیادہ لحاظ کیا کرتے تھے ایک دن آپے سے باہر ہو ہی گئے اور ہم سب کے سامنے ہی پستول نکال لیا کہ وہ خود بھی مار لیں گے اور خالہ کو بھی مار دیں گے۔ والد صاحب کے بیچ بچاؤ پر غصہ تو تھما لیکن میاں بیوی کے بیچ دوری کی ایک خلیج بڑھتی چلی گئی۔
پھر ایک دن یہ خلیج اتنی بڑھی کہ خالو صاحب، خالہ صاحبہ سے بے تعلق ہو کر اس بمبئی والی عورت کو لے کر گھر سے نکل گئے اور ایسے نکلے کہ پھر کبھی گھر میں قدم نہ رکھا۔

اس کے بعد کئی سال یوں ہی بیت گئے۔ خالہ اس گھر میں اکیلی رہنے لگیں۔

چونکہ انہیں جاگیر سے گزارہ ملتا تھا جو ان کے پہلے مرحوم شوہر کی طرف سے تھا۔ پھر ان کا اکلوتا بیٹا بھی جو جوان ہو گیا تھا پولیس میں بھرتی ہو گیا، اس لئے انہیں مالی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ پھر ہمارا خالہ کے یہاں جانا آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ گرما کی چھٹیاں وہاں گذارنے کا خیال ہی چھوٹ گیا تھا کیونکہ ہم سب بڑے ہو چکے تھے اور کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ خالہ کا وہ لڑکا جو پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا ایک دن گھر سے بھاگ کر کہیں شادی رچائی تھی اور الگ رہنے لگا تھا۔ پھر وہ خالہ کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں اور کیں اور اب وہ پولیس کی نوکری بھی چھوڑ کر غیر ملکوں میں ڈرائیور ہے اور دونوں ہاتھوں سے خوب کما رہا ہے، لیکن خالہ کو ایک پائی بھی نہیں بھیجتا۔

ہمارے اسکول سے نکل کر کالج اور پھر کالج سے نکل کر نوکری میں آنے کے دوران بہت سے تغیرات ہو گئے۔ والدہ اس دوران اچانک ہی فوت ہو گئیں اور والد صاحب طویل بیماری کے بعد رحلت فرما گئے......

خالہ صاحبہ جو کبھی کبھار ہی ہمارے یہاں آیا جایا کرتیں تھیں' والدہ کے انتقال کے بعد تو ان کا آنا جانا بالکل ہی چھوٹ گیا۔

ہم سب بھائیوں کی بھی شادیاں ہو چکیں تھیں اور سب اپنے اپنے گھروں سے لگ گئے تھے۔ میں وقار آباد چلا گیا تھا۔ چونکہ میرا ٹرانفسر وہاں ہو گیا تھا اور میں وہاں اپنے بیوی بچوں میں خوش رہنے لگا تھا۔

ایک دن صبح صبح زہرہ جو میری بیوی ہے اس نے مجھے چونکا دیا۔ میرے سامنے اس نے ایک پرانا اخبار کھول کر اس کی' ایک خبر پر انگلی رکھ دی خبر طلاق کے بارے میں تھی کہ ایک مرد نے ایک عورت کو وکیل کے توسط سے بہ ذریعہ اشتہار دی تھی۔ لیکن میں پھر بھی کچھ سمجھ نہ سکا کیونکہ میرا اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا کہ یہ نام تو خالہ اور خالو صاحب کے ہیں؟ اس لئے کہ ان کے اصل نام میرے ذہن سے تقریباً نکل چکے تھے۔ چنانچہ اس خبر کو پڑھ کر مجھے بڑا صدمہ ہوا......

اس کے کچھ ہی دنوں بعد اخبار میں یہ خبر بھی پڑھنے کو ملی کہ خالو صاحب کا انتقال ہو چکا ہے...... بعد میں معلوم ہوا کہ اختری کے بہکاوے میں آ کر خالو صاحب نے مرنے سے کچھ دنوں پہلے خالہ کو اس لئے طلاق دے ڈالی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کا سارا وظیفہ اختری کو مل جائے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کسی نے خالہ تک یہ خبر پہنچائی بھی ہے یا نہیں۔ چونکہ خالہ کا اکلوتا لڑکا باہر کے ممالک میں خوب کمائی کی غرض سے چلا گیا تھا' خالہ سے بے تعلق ہو کر--- پھر ہمارے بھائیوں میں سے ایک بھائی پاکستان منتقل ہو چکے تھے اور دوسرے بھائی بمبئ جا بسے تھے۔ اس طرح سبھی بہ حالت مجبوری خالہ سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں اچھی یا بُری کوئی کیفیت کوئی کسی تک کیسے پہنچا سکتا کہ خالہ کس حال میں ہیں۔

وہ رات میں نے ان ہی خیالات میں بڑی بے چینی سے گزاری اور صبح اٹھ کر ارادہ کر لیا کہ حیدر آباد جا کر خالہ کی کیفیت لوں گا اور انہیں تسلی دوں گا اور ساتھ ہی اپنے ٹرانسفر کی کارروائی بھی شروع کر دوں گا' چونکہ میرا دل اب وقار آباد سے اُوب چکا تھا۔

حیدر آباد پہنچ کر پہلے میں نے ہیڈ آفس میں اپنے ٹرانسفر کی ابتدائی کارروائی کی پھر کئی دوسرے ضروری کاموں کو نپٹانے کے بعد جو کہ آفس ہی سے متعلق تھے' سیدھا وہاں سے خالہ سے ملنے کے لئے چل نکلا......

خالہ کا گھر چونکہ پرانے شہر کے ایک نواحی علاقے میں ہے اور یہ علاقہ اب کافی بدل چکا ہے کہ اس کے تمام دروازے جو قدیم تھے' ڈھا دیئے گئے تھے۔ اس لئے وہاں جانے کے بعد مجھے علی آباد کا وہ قدیم دروازہ دیکھائی نہیں دیا۔ جو پہلے تھا۔ اب وہاں کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں اور کئی نئی نئی کالونیاں بس گئیں تھیں۔ اس کے باوجود مجھے اس دقیانوسی گھر کو ڈھونڈ نکالنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی' چونکہ وہ گھر اور

ں کا وہ بڑا چوبی دروازہ ابھی تک جوں کا توں کھڑا تھا۔ وہ منحوس گھر اور اس کا بڑا دروازہ دیکھتے ہی میرا دل
ر ہی اندر ہی دھڑکنے لگا اور عجیب وغریب خیالات میرے ذہن میں بڑی تیزی سے چکر لگانے لگے اور
ے اس گھر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔

جیسے ہی میں نے دروازے میں قدم رکھا اور بائیں طرف نگاہ دوڑائی' دھک سے رہ گیا مطب کے بیچ
ن میں نیم کا پیڑ ابھی بھی اسی حالت میں جوں کا توں کھڑا تھا۔ اس کے پتے اسی طرح آہستہ آہستہ جھڑ رہے
ے ---- پھر قبل اس کے میرے ذہن میں پہلے کی طرح کوئی دہشت ناک خیال آتا اس پیڑ کے بارے میں کہ
نک طاقچے میں میری نگاہ ٹھہر گئی۔ وہاں کھوپڑی ندارد تھی۔ میں اور آگے بڑھا اور جوں ہی مطب سے گھر
ں قدم رکھا' دہشت سے پیچھے ہٹ گیا۔ بیچ صحن میں بنے حوض میں سے ایک معلق سر صاف دکھائی دے رہا
۔ جس کے سر پر بال نہیں تھے وہ ایسا ہی چکنا تھا جیسے اس کے سر پر کبھی بال تھے ہی نہیں۔ لیکن خالہ کہاں تھیں؟
ر خالی پڑا تھا اور میں خالہ کو پکارنا چاہتا تھا کہ یکا یک شہتوت کے درخت کی طرف سے ایک تلتلاتی آواز
ئی ۔ اماں کانٹا چبا۔ تبھی میرے ایک پیر پر جس میں صرف چپل تھی کوئی چیز چلتی ہوئی اُوھر چڑھی...... کہیں یہ
و تو نہیں ...... میں نے پیر کو زور سے جھٹکا۔ پٹ کے ساتھ جو چیز نیچے گری وہ ایک بچھو ہی تھا اور اپنی ڈنک
پر اٹھائے بڑی تیزی سے ایک بل میں گھس گیا...... مجھے یاد آیا...... اکثر شہتوت کے درخت کی طرف سے
و ہی نکلا کرتے تھے اور میرے بھائی کو کاٹ لیا کرتے تھے۔ شہتوت کا درخت تو بالکل ننگا جیسے ہاتھ باندھے
ڑا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن خالہ ہڈیوں کا پنجر کسی بے چین روح کی طرح حوض میں سے باہر نکلیں اور
ں معلق سر کے نیچے جو دراصل وہی کھوپڑی تھی نیچے صراحی رکھ کر نل کی ٹونٹی کھولے اس پانی کو صراحی میں بھر رہی
یں جو کھوپڑی کی چکنی سطح پر گر کر اس پر اس پھسلتا ہوا صراحی میں گر رہا تھا......

میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔! اس کا مطلب یہ تھا کہ خالہ اب طاغوتی طاقتوں کے سہارے اپنے اس
۔ ہر پر قابو پانا چاہتی ہیں جواب اس دنیا میں نہیں اور جنھوں نے اپنی دوسری جوان بیگم اختری کے بہکاوے
ں آکر مرنے سے کچھ دنوں پہلے انہیں طلاق دے ڈالی تھی۔ اگر میں اس وقت یہ بات خالہ کو بتلا دوں تو؟
--- لیکن میں جس بات سے زیادہ خائف تھا وہ یہ کہ یہاں اب بڑی تیزی سے اندھیرا پھیلتا چلا جارہا تھا۔
غرب کا وقت ہو چکا تھا اور وہ تمام درخت جو کبھی ہرے بھرے تھے اب سوکھ کر کانٹا ہو چکے تھے۔

ان درختوں کے درمیان جو حنوط شدہ لاشوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے' خالہ کا وجود بھی ایک
یسے وضع قطع کے انسانی درخت کی طرح لگ رہا تھا جو سوکھ کر کانٹا ہو چکا ہے ...... اس دہشت ناک خیال
ے آتے ہی میرے حواس معطل ہو گئے اور میں وہاں سے اس طرح بھاگ کھڑا ہوا جیسے کسی نے میری

گردن میں ہاتھ دے کر وہاں سے مجھے باہر ڈھکیل دیا ہے۔

وقار آباد آنے کے بعد دو تین دن تک میں بخار سے پھنکتا رہا۔ چوتھے دن طبعیت ذرا کچھ سنبھلی۔ زہرہ میرے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں' میرے سر کو دباتے ہوئے بولیں۔ ''آپ خالہ کے یہاں گئے۔ کیا آپ ان کی قبر پر بھی گئے تھے؟''

''کیا۔؟'' میں چونکتا ہوا اٹھ بیٹھا آپ کو نہیں معلوم---؟ پھر آپ وہاں کس سے ملنے گئے تھے۔ جس دن آپ وہاں گئے تھے اس سے ایک دن پہلے ہی خالہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اسی گھر میں جہاں وہ اکیلی رہتی تھیں۔ اور ان کا انتقال بھی کب ہوا معلوم نہیں۔ جب ان کا بیٹا جو دوبئی سے لوٹا تھا وہ گھر میں گھسا تو اسے ماں حوض میں بیٹھی ہوئی دیکھائی دیں لیکن جب اس نے انہیں چھوا تو ان کا بدن برف کی طرف سرد ہو چکا تھا۔ جانے ان کی روح کب کی پرواز کر چکی تھی معلوم نہیں''۔

''لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''ان کے بیٹے سے جو ڈرائیور ہے۔ وہ باہر سے آ گیا ہے اور اپنی لاری کے ساتھ یہاں سے ہوتا ہوا بمبئی جا رہا تھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ آپ یہاں ہیں۔ اور وہ پتہ اٹھاتا ہوا یہاں آیا تھا۔ سارے حالات اس نے ہی مجھے سنائے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا دل اب اس گھر میں جانے کے لئے نہیں ہے جہاں خالہ رہتی تھیں۔ اس لئے وہ اس گھر کو اسی طرح کھلا چھوڑ آیا ہے اور کہہ رہا تھا کہ وہ عنقریب ہی اس منحوس گھر کو اونے پونے داموں فروخت کر دے گا جو اس کے نزدیک سحر زدہ ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اب اس گھر میں جاتے ہوئے اسے وحشت سی ہونے لگی ہے۔ چونکہ [illegible] کی لاش کے بازو ایک کھوپڑی اور صراحی رکھی ہوئی تھی اور صراحی کا پانی کا برف کی طرح سرد تھا''۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ میں جو کچھ وہاں دیکھ آیا تھا وہ اسی طرح بیتا تھا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ واقعہ دوبارہ فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھوم جائے ہو سکتا ہے یہ میرے بچپن کا تصور ہو۔ اس طرح میں اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہوں۔ لیکن تلتلاتی آواز۔ اماں کا نٹا چبا۔ کس کی تھی؟ اس بارے میں' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آواز بھی میرے لاشعور کی دین ہو۔ جو میرے چھوٹے بھائی کی ہی تھی۔ یہ بھی مان لینا پڑے گا کہ خالہ کے دل میں بھی خالو کی یاد کا کانٹا ایسے ہی چبھا ہوا تھا جو مرنے کے بعد ان کے دل سے نکل نہ سکا۔ چنانچہ مرنے کے بعد بھی وہ خالو کی یاد کے خلاء کو اس طرح پر کر رہی تھیں جیسا کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کرتی تھیں۔

اشرف علی نائی

شہنشاہ و مہارج کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔ اگر جھکاتے بھی ہیں تو وہ نائی ہوتے ہیں یا اگالدان تعظیم سے نہیں بلکہ ضرورتاً۔ نائی گرامی نائی بڑے باتونی ہوتے ہیں اور ہر فن مولا۔ کبھی اُن سے سابقہ پڑتا ہے تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب کھینچ کھانچ کے بال نکالے گئے---

اشرف علی کا پیشہ نائی گیری نہیں تھا۔ لیکن جب اشرف علی کو باپ کی اچانک موت کے بعد جو فوج میں ملازم تھا۔ نوکری کی سخت ضرورت محسوس ہوئی تو فوجی اعلیٰ عہدہ داروں نے اس کے باپ کا لحاظ کرتے ہوئے جو اپنی ڈیوٹی بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا کرتا تھا نائی کی ایک خالی جائیداد پر اُس کا تقرر کر لیا اور یوں اشرف علی نائی بن گیا۔

فوج میں اشرف علی اپنی ملازمت کی مدت میں جب تک کہ وہ برسر روزگار رہا آفیسروں سے لے کر جوانوں تک کی ڈاڑھیاں اور ان کے بال بنایا کرتا تھا--- یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہندوستان کو ابھی سوراج نہیں ملا تھا۔ پورے ہندوستان میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن کے خود مختار راجے مہاراجے یا شہنشاہ تھے۔

اس طرح ریاست حیدرآباد پر بھی جس آصف جاہی خاندان کی حکمرانی تھی اس کے آخری شہنشاہ نظام سابع تھے۔ جن کی اپنی ذاتی فوج بھی تھی۔ جو چھوٹے چھوٹے رسالوں پر مشتمل تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد جب ریاست حیدرآباد کا انضمام یونین گورنمنٹ میں ہو گیا تو نظام کی آصف جاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ساتھ ہی ان کی ذاتی فوج بھی تحلیل کر دی گئی۔ اشرف علی بھی اس کی تحلیل کی زد میں آ گیا۔ لیکن وہ چوں کہ کئی چھوٹے سے لے کر بڑے آفیسروں کی اصلاح بنا چکا تھا۔ اس لئے یہ پیشہ ہی اُس کے کام آ گیا اور وہ حیدرآباد سے اٹھ کر اس کے ایک چھوٹے سے تعلقے وقارآباد میں بس گیا۔

اشرف علی کے تعلقہ وقارآباد میں بسنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ پولیس ایکشن کے بعد وہاں کے نائیوں نے ایک مسلمان مجسٹریٹ کی اصلاح بنانے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ مجسٹریٹ ایک مسلمان ہے۔ لیکن نائیوں نے حیلہ یہ بنا دیا تھا کہ اگر مسلمان مجسٹریٹ کو ہمارے سے اصلاح بنوانی ہی ہے تو وہ ہمارے اصلاح

خانوں میں آئے ہم ان کے گھر پر جا کر اصلاح نہیں کریں گے۔ اب مجسٹریٹ جو اس کا عادی نہیں تھا پریشان ہو گیا تھا اور اس نے اپنے ذاتی خرچ پر اشرف علی کو جس کو وہ اپنے باپ کے زمانے سے جانتا تھا اور جس نے اس کے کرنل باپ کی بھی اصلاح بنائی تھی حیدر آباد سے وقار آباد بلوالیا۔ اور یوں اشرف علی نے یہاں بھی اپنا کاروبار جمالیا اور ان آفیسروں کے بنگلوں پر بھی جانے لگا جو اصلاح خانے جانے کے عادی نہیں تھے۔

آزادی کے کئی سالوں بعد میری پوسٹنگ وقار آباد میں ہوئی تو وہاں پہلے میری مدبھیڑ اشرف علی ہی سے ہوئی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر اپنی سائیکل پر اصلاح کے ساز و سامان کا ڈبہ باندھے چلا جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گیا تھا اور اس نے مجھے میرے نئے آفس کا پتہ بتلایا تھا جو ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا۔

حیدر آباد میں اشرف علی کا گھر کسی زمانے میں ہمارے گھر سے متصل تھا۔ وہ روز صبح تقریباً ڈیڑھ دو میل کا طویل سفر شہر سے دور فوجی بیرکوں میں سائیکل پر ہی پیچھے کیریئر پر اصلاح کے ساز و سامان کا ڈبہ باندھے اپنی ڈیوٹی بہ حسن خوبی انجام دیا کرتا تھا۔

آج بھی اشرف علی وہی کرتا ہے وہ روز اپنی سائیکل پر چڑھا لنگی اُوپر چڑھائے سائیکل کے پیچھے کیریر پر اصلاح کے ساز و سامان کا زنگ آلود ڈبہ باندھے عجیب و غریب ہنڈل پر جو کسی کرنل کی بڑی بڑی موچھوں کی طرح پیچھے کی طرف خم کھایا ہوا ہے۔ اسے پکڑے۔ سائیکل پر جھکا ٹیڑھے میڑھے پہیوں کو پیڈل سے گھماتا ہوا آتا جاتا دکھائی دیتا ہے تو دور سے دیکھنے والوں کو سائیکل کے اس عجیب و غریب ہنڈل پر جو۔ بے تحاشہ دائیں بائیں ہل رہا ہوتا ہے۔ اشرف علی کے ہاتھوں کی سخت گرفت کے باوجود تو یوں ہی لگتا ہے جیسے دو پہلوان دنگل میں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ تو اشرف علی کے سائیکل کی بات ہوئی لیکن جو بات میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے بھی اُس مسلمان مجسٹریٹ کی طرح اصلاح خانے جانے کی عادت نہیں تھی۔ اس لئے اشرف علی میرے بھی گھر آنے لگا۔ اس نے میری داڑھی اور سر کے بال کاٹتے ہوئے ہمیشہ نائیوں کی طرح ان کی چرب زبانی کی وہ روایت برقرار رکھی جس کو سنتے سنتے کوئی بھی اس میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اصلاح کے دوران ہونے والی تمام تکالیف کے سوا وقت کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔

اشرف علی اپنے اس پیشے میں کہاں تک یکتا ہے۔ اس سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ چونکہ اُس کی اصلاح سے آراستہ سر ایک فوجی کا ہی سر لگتا ہے جہاں سر کے بال لانبے رکھنے کی ممانعت ہوتی ہے خواہ کچھ ہو لیکن ایسی اصلاح مجھے آج کل کی بے ہودہ کٹنگ سے زیادہ اچھی لگتی۔ اشرف علی کا کہنا بھی یہی ہے کہ آج کل نوجوان اصلاح خانوں میں بال نکلوانے نہیں جاتے بلکہ صرف پیسے دینے جاتے ہیں اور بال ویسے ہی لیئے واپس آجاتے ہیں سچ بات تو یہ ہے کہ اشرف علی کو اصلاح خانوں سے جیسے ازلی بیر تھا۔ وہ جب اصلاح

بعد میرے ہاتھوں کے ناخن اپنے تیز نشتر سے تراشتا تو کہتا''۔ اصلاح خانوں میں میاں بھلا ناخن کون
تا ہے۔ وہاں انہیں یہ دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی کہ بغل کے پاس بال کتنے بڑھ گئے ہیں
موصاً میرے پیر کے ناخن تراشتے ہوئے اشرف علی بتلاتا---''دیکھو تو میاں آپ کے پیر کے انگوٹھے
خن کتنا سخت اور بازوؤں میں کتنا خمیدہ ہوگیا ہے کہ وہ کونوں میں انگوٹھے کی کھال تک میں دھنستا جارہا
ب اسے صحیح طریقے سے کونوں کے اندر سے نہ تراشا جائے تو کتنا خراب معلوم ہوگا۔ خدا جھوٹ نہ
ئے بھلا بتلایئے کیا ہمارے نشتر کی طرح آج کل کے یہ فیشن ایبل نیل کٹر اندر تک اُتر سکتے ہیں؟''
شاید اشرف علی کا یہ کہنا صحیح ہی ہوگا۔ کیوں کہ مجھے کبھی نیل کٹر استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔
ف علی تو بڑی پابندی سے صبح صبح میرے یہاں آجایا کرتا تھا۔
ہمارا چھوٹا لڑکا یونس اشرف علی کو ان کی وہی پرانی زنگ خوردہ سائیکل پر دور سے آتا ہوا دیکھتا' اس
ح کے ان کے دنوں ہاتھ جو سیکل کا ہینڈل پکڑے ہوئے ہوتے ہیں بُری طرح ہل رہے ہیں۔ دائیں
ں تو وہ بھی گھر میں آکر بالکل اسی طرح اپنے دونوں ہاتھوں کو اسی طرح اُسی انداز میں حرکت دیتے جیسے
شرف علی کے ہاتھ از خود ہینڈل پکڑے ہوئے ہل رہے ہوتے ہیں دائیں بائیں کہتا---''اشرف علی
سائیکل یوؤں! یوؤں!! یوؤں!!! تو مجھے اس کے ہاتھوں کی ایسی دلچسپ حرکت اور وہ مختصر سے بول کسی
تشبیہ سے زیادہ کامیاب لگتے جو اشرف علی اور ان کی سائیکل کے بارے میں کہے گئے ہوں۔ اور اکثر
ہی ہوا کہ اشرف علی کے آنے کی اطلاع میرے چھوٹے لڑکے نے مجھے اپنے اسی دلچسپ انداز میں دی۔
وقت میں کسی بھی کام میں مصروف ہوتا تو سنبھل کر بیٹھ جاتا کہ اشرف علی کی کراری آواز''میاں!'' کچھ ہی
ں بعد باہر کے دروازے کی راہ میرے کانوں میں سنائی دیتی۔
ایک دن صبح صبح میں اشرف علی کے ہاتھوں اپنی اصلاح بنواتے ہوئے سر جھکائے اس کی چرب زبانی
محو تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اس کا احساس ضرور ہو رہا تھا کہ اصلاح کے وہ پرانے اوزار جن پر ایک
نے سے سان نہیں چڑھائی گئی ہے مجھے کتنی تکلیف دے رہے ہیں کہ اشرف علی نے اپنی قینچی کی طرح
تی ہوئی زبان سے ایک دھماکہ کیا۔
''میاں! اب میں آپ کو اور کیا بتلاؤں کہ میں اپنے اس کام کے علاوہ جڑی بوٹیوں کے علاج سے
ں واقف ہوں......کوئی بھی پھوڑا ہو۔ پھنسی ہو۔ خارش ہو یا داد۔ ہر جلدی بیماری کا علاج میرے پاس
ہے۔ حتی کہ میں مردوں کی کمزوری کا بھی علاج بہ خوبی جانتا ہوں۔ اور ایسے کتنے ہی کمزور مردوں کو میں نے
ں ہی جڑی بوٹیوں کی مدد سے اتنا کارآمد بنا دیا کہ وہ چار چار شادیاں کرنے کے قابل ہوگئے وہ بھی میں
پ کو اس لئے بتلا رہا ہوں میاں کہ شائد آپ کے توسط سے ہی کسی کو میری ضرورت پڑ جائے''

یہ بات کہاں تک سچ ہے اور کہاں تک جھوٹ اس کی تصدیق کرنے کی ضرورت نہ کبھی مجھے محسوس ہوئی اور نہ ہی میرے توسط سے کسی دوسرے کو تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ مسلسل کئی سالوں سے اشرف علی کے ہاتھوں اپنی اصلاح بنواتے مجھے آہستہ آہستہ یہ احساس ہونے لگا کہ اشرف علی کے قویٰ اب زوال پذیر ہیں اور ساتھ ساتھ اس کے اصلاح کے اوزار بھی میں تو کسی حال ان خراب اوزاروں کو برداشت کر لیتا جو اصلاح بنواتے وقت بڑی تکلیف دیتے اس طرح جیسے نوجوان عورتوں کو بھی موچنا سے غیر ضروری بال اکھیڑے جانے پر ایسی ہی تکلیف سے گزرنا پڑتا ہوگا۔ لیکن ہمارے بچے کبھی اس تکلیف کو برداشت نہیں کر پاتے وہ ہر بار اشرف علی کے آنے سے پہلے ہی باہر اصلاح خانوں کا رُخ کرتے۔

خواہ کچھ ہو مجھے وقار آباد میں رہتے دوسرے معنوں میں اشرف علی کے ہاتھوں اپنی اصلاح بنواتے پورے پانچ سال ہوگئے تو میں نے سوچا --- میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا اور اُسے اصلاح خانے جانے کی عادت نہ ہوتی تو وہ شائد وقار آباد چھوڑ کر ہی بھاگ جاتا یا پھر اپنی اسی عادت کو ترک کر کے اصلاح خانے جانے کی عادت ڈال لیتا اور اشرف علی کے منڈا اصلاح کے اوزاروں کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دیتا لیکن ...... میں ایسا کبھی نہ کر سکا کیوں کہ مجھے تو صبح اُٹھتے ہی اشرف علی کا ہی انتظار رہتا اور میرے چھوٹے لڑکے کو بھی جو اشرف علی اور ان کی سائیکل کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر دوڑتا ہوا میرے پاس آتا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اشرف علی کے ہینڈل پکڑے ہوئے ہاتھوں کی طرح جو بُری طرح ہینڈل پکڑے ہل رہے ہوتے ہیں کہتا۔ ''اشرف علی کی سائیکل یوؤں۔ یوؤں!! یوؤں!!''

ایک دن ہمیشہ کی طرح صبح صبح میرے لڑکے نے اپنے اُسی دلچسپ انداز میں اشرف علیکے آنے کی اطلاع دی۔ میں آفس کے کام میں مصروف تھا کہ سنبھل کر بیٹھ گیا...... کچھ ہی لمحوں بعد باہر کے دروازے سے ایک کراری آواز اندر کی طرف آتے ہوئے میرے کانوں میں گھسی ...... ''میاں!'' --- اس کے ساتھ ہی اشرف علی جبکہ اپنے زنگ آلود اصلاح کے ڈبے کے میرے سامنے اس طرح موجود تھا کہ اس کے بوڑھے جھریوں بھرے ہاتھوں پر مہندی کا سرخ رنگ چڑھا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور مذاق سے پوچھا:

''اس عمر میں اب کس کی حجامت بنانے کا ارادہ ہے اشرف علی'' اشرف علی نے جھٹ اپنے مہندی سے رچے سرخ سرخ ہاتھوں کی طرف دیکھا پھر ہنستے ہوئے اپنے اُسی زنگ آلود اصلاح کے ڈبے کو نیچے رکھ کر فرش پر آرام سے بیٹھ گیا اور جیب سے بیڑی نکال کر اُسے سلگانے کے لئے ماچس کی ڈبیہ کو جیب میں ٹٹولتے ہوئے کھانستے بولا۔

''اللہ آپ کو سلامت رکھے میاں...... میرے حساب سے تو یہ میری چوتھی بیوی ہوگی دراصل میاں

خدا جھوٹ نہ بلوائے ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی میرے گلے پڑ گئی۔ بس آپ کو اور کیا بتلاؤں جتنے لوگوں کی حجامت میں نے کی ہے اس سے کہیں زیادہ عورتوں کے پیٹ میں نے گرائے ہیں ان ہی جڑی بوٹیوں سے یہاں کی اور آس پاس گاؤں کی تمام رنڈیاں کیا گھریلو عورتیں بھی میرے یہاں آتی ہیں اور میری جڑی بوٹیوں کی دواؤں سے مستفید ہوتی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اشرف علی نے بیڑی کو ہونٹوں میں دبا کر ماچس کی تیلی کو ڈبیہ کے مسالحہ لگی ہوئی سطح پر ایک جھٹکے کے ساتھ گھس کر شعلہ پیدا کیا اور بیڑی کے دوسرے سرے کو جلا کر اُس سے ایک لانبا کش اپنے اندر کھینچا اور پھر منہ سے اوپر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

''اوپر والا بڑا کارساز ہے میاں...... جہاں وہ ایک در بند کر دیتا ہے تو دوسرا در کھول دیتا ہے۔ اب آپ ذرا سوچئے بھلا اس نائی گیری اور ان خراب اوزاروں سے میرا پیٹ کیسے بھرتا۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے میرا جڑی بوٹیوں والا علاج تو صد فیصد کامیاب رہتا ہے اگر کبھی ناکام بھی ہو جائے اور بچہ عورت کی بچہ دانی کو کھینچ کر پکڑ لے اور باہر نہ نکلنے پائے تو میں اس عورت سے شادی کر لیتا ہوں یا پھر اپنے ہی کس مریض سے اس کی شادی کرا دیتا ہوں۔ یوں مجھے ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا اور میری نیک نامی بھی متاثر نہیں ہوتی۔

اور جب اشرف علی یوں اپنی چرب زبانی کا سلسلہ قائم رکھے ہوئے اپنے خراب اور منڈ استرے سے میری داڑھی کے بال گھسیٹ رہا تھا دوسرے معنوں میں انہیں جڑ سے اکھیڑ رہا تھا تو میں اس ناقابل برداشت کرب میں ابتلاء یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ٹھیک اسی طرح اشرف علی اپنی جڑی بوٹیوں کی مدد سے بچے کو بھی بچے دانی سے باہر کھینچ لاتا ہوگا تو بچے پر کیا گزرتی ہوگی۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے اس دن بعد اور آج کا دن اشرف علی سے میری ملاقات نہیں ہو سکی چونکہ میرا ٹرانسفر اس کے دوسرے ہی دن وقار آباد سے حیدر آباد ہو گیا۔

آج بھی کئی سالوں بعد اشرف علی مجھے اس وقت ضرور یاد آ جاتا ہے جب میں اپنی عادت کو بہ حالت مجبوری ترک کر کے حیدر آباد آنے کے بعد اصلاح خانے میں گھنٹوں انتظار میں بیٹھا رہتا ہوں اپنی باری کے اور اصلاح کے بعد گھر آ کر بلیڈ سے اپنے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن تراشنے لگتا ہوں تو اشرف علی کی کراری آواز ہمیشہ میرے کانوں کے بالکل قریب ہی سنائی دینے لگتی ہے۔ ''میاں'' آپ کو بغلوں کے بال اور آپ کے انگوٹھوں کے ناخن......''

معلوم نہیں اشرف علی اب وقار آباد میں ہے بھی یا مر کھپ گیا ہے۔ لیکن اس کی وہ کراری آواز ہمیشہ میرے کانوں کے لئے تاحیات زندہ رہے گی جو اس کی چرب زبانی کا نتیجہ تھی۔

بلا عنوان

کہانی ''بلا عنوان'' ہے۔ اگر آپ کوئی موزوں عنوان لکھ بھیجیں مصنف کے پتہ پر تو دوسرا مجموعہ ''ڈھاک کے دو بات'' مصنف کا ہی آپ کے نام و پتہ پر ارسال کر دیا جائیگا ''تحفتاً'' --- صرف ڈاک خرچ و دیگر اخراجات دس روپئے ارسال فرمائیں۔

سلمیٰ کے لڑ جھگڑ کر میکے چلے جانے کے بعد جاوید دوسری شادی کے بارے میں سنجیدہ ہو گیا۔ چونکہ وہ گھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ماں باپ کبھی کے گزر چکے تھے۔

ان کی شادی کو ہوئے بیس سال ہو چکے تھے لیکن وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے یہ وجہ دوسری شادی کے لئے موزوں بھی تھی لیکن اس کے لئے بھی اجازت کی ضرورت تھی' چونکہ --- قانون میں سرکاری ملازم کے لئے اس کی گنجائش کہاں تھی۔

جبکہ سلمیٰ اسے چھوڑ کر میکے جا بسی تھی اسی مجبوری میں وہ قانون کو لکھتر گالیاں دے ڈالتا۔ معلوم نہیں کس اُلو نے یہ قانون بنایا ہے کاش قانون بھی ایک شوہر ہوتا اور اس کی بیوی اسے چھوڑ کر میکہ چلی جاتی تب اُسے پتہ چلتا۔ یا پھر قانون کو کوئی اولاد نہیں ہوتی تو دیکھنا وہ کب تلک پہلی بیوی پر ناڑا باندھ کر رہتا۔

یار لوگوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے قانون کے ساتھ اس کا بھی خوب مذاق اڑایا۔

''ارے کیا قانون قانون کی رٹ لگا رکھی ہے میاں! قانون کوئی شیر ہے جو تمہیں کھا جائے گا۔ قانون کی آنکھوں پر ہاتھ رکھو اور دوسری شادی کر ڈالو۔ تمہاری تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے''۔

سلمیٰ دعوے کر دے گی تو میری نوکری چلی جائے گی'' وہ روہانسا ہو کر رہ جاتا۔

اسی مجبوری میں رہتے رہتے تین مہینے گذر گئے۔ سلمیٰ کو میکہ سے لوٹ کر نہ آنا تھا نہ آئی تو جاوید نے اس کے تعلق سے سوچنا ہی چھوڑ دیا اور دوسری شادی کے بارے میں مزید سنجیدہ ہو گیا۔

وہ روز صبح اُٹھتے ہی اخبار میں خبروں سے پہلے شادیوں کے کالم دیکھنے لگا کہ عقدِ ثانی کے لئے کوئی موزوں رشتہ مل جائے۔ اس کی شرط یہ تھی کہ لڑکی خوبصورت ہو دین لین کا کوئی سوال نہیں بلکہ زیادہ مالدار بھی نہ ہو کیونکہ مالدار لڑکی سلمیٰ جو خوبصورت نہیں تھی اس کا حال وہ دیکھ چکا تھا۔ جو ہمیشہ ماں باپ کے گھر پر

اس کے گھر سے زیادہ فوقیت جتاتی تھی۔

ایک دن اخبار دیکھتے ہوئے اس کی نظر پیغامات کے ایک ایسے ادارہ پر پڑی جہاں عقدِ ثانی کے کچھ رشتے تھے لڑکے اور لڑکی دونوں کی طرف سے۔

اس ادارہ میں اس نے اپنا نام بھی رجسٹرڈ کروا دیا۔

ادارہ کا ملازم اس کی دی گئی معلومات پر نظر ڈالتے ہوئے مسکرانے لگا......

عجیب بات ہے جناب آپ لڑکی ایسی چاہتے ہیں جو مالدار نہ ہو۔ سبھی مالدار لڑکیاں چاہتے ہیں خوب پیسے والی' جس پر وہ عیش کریں۔ خیر پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا -- یہ دیکھئے ---'' اس نے بہت سی تصویروں کے لفافہ میں اسے ایک تصویر نکالی اور اس کی طرف بڑھا دی۔

''لڑکی مالدار تو نہیں جناب خوبصورت ہے۔ نوکری بھی کرتی ہے۔ ایک بوڑھا باپ ہے اس کے ساتھ بس اور کچھ نہیں دو بھائی باہر ہیں۔ لیکن اس زمانے میں کون کسی کو پوچھتا ہے جناب...... لڑکی آپ کو ضرور پسند آجائے گی۔ اس کی میں گارنٹی دیتا ہوں۔''

تصویر ایک پرکشش عورت کی تھی بال کٹے ہوئے تھے۔ گلابی ساڑی میں ملبوس وہ بڑی پرکشش لگ رہی تھی۔ جاوید کو پسند آگئی۔

پھر بہت سی فائلوں میں سے ایک فائل نکال کر ادارہ کے ملازم نے اس کی طرف بڑھا دی --- یہ دیکھئے فائل میں عورت کے تعلق سے ساری تفصیلات درج ہیں''۔

وہ ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔ ماہانہ یافت اٹھارہ سو روپے۔ شوہر چھوڑ چکا ہے۔ دو بھائی باہر ہیں۔ باپ وکیل۔ جھٹ اس نے فائل میں سے دیگر تفصیلات کے ساتھ نام اور پتہ نوٹ کرلیا اور ادارہ کے ملازم سے ہاتھ ملا کر اس کا بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے اسکوٹر پر وہاں سے رخصت ہوا۔

ساری رات وہ بستر پر دوسری شادی کے متعلق سوچتا رہا --- بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے ذہن و دل پر وہ خوبصورت چہرہ جیسے نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

دوسرے دن آفس سے لوٹتے ہوئے وہ سیدھا اپنے دوست کے گھر گیا۔ ساری تفصیلات بیان کرنے کے بعد اپنے دوست کے ہمراہ ملازم کے بتائے ہوئے پتے کی کھوج میں نکل پڑا۔

گھر کیا ایک معمولی سا فلیٹ تھا تیسرے مالے پر۔ وہاں عورت کے بہنوئی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا --- ان سے ملنا ہو تو گول ناکہ کے قریب ایک اسکول ہے --- گولڈن جوبلی اسکول۔ ان سے آپ وہیں صبح دس تا ساڑھے دس کے درمیان مل کر بات کرلیں''۔ اب پانچ بج چکے ہیں وہ آپ سے نہیں

ملیں گی۔‘‘

تیسرے دن جاوید علی الصباح اٹھا شادی کے قبل عورت کی شخصیت کا جائزہ لینے کی خواہش نے اور زور پکڑلیا۔ چنانچہ جلدی جلدی بغیر کھائے پیئے ہی تیار ہو کر اپنے دوست کو ساتھ لئے اسکول پہونچا۔

اسکول بڑا شاندار تھا‘ جس کے بیچ و بیچ ایک بڑا سا گراؤنڈ تھا۔ خوبصورت ایک چھوٹا سا گارڈن بھی تھا جہاں ہمہ اقسام کے رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔

پوچھنے پر چوکیدار نے بتایا۔ اب چھٹی ہونے ہی والی ہے۔ آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں اطلاع کر آتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد وہ آیا اور بولا ’’آپ باغیچہ میں ٹھہرئیں۔ وہ آپ سے وہیں ملیں گی‘‘۔

دونوں باغیچہ میں جا کر ٹھہر گئے۔ جاوید بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھنے لگا۔ اس کا دوست یوں ہی پھولوں کے گملوں کو دیکھنے لگا...... تبھی پیچھے سے ایک نسوانی آواز جلترنگ کی لئے لیئے ہوئے گونجی Who is candidate (کینڈیڈیٹ کون ہے)

دونوں چونک کر پلٹے۔ بڑے دل کش انداز میں ٹھہری ہوئی وہ وہی تھی فوٹو والی عورت بلکہ اپنے فوٹو سے بھی زیادہ حسین اور زیادہ پُرکشش۔

اس کے دوست نے جاوید کی طرف اشارہ کر دیا ’’He is Madam‘‘ (یہ ہیں میڈیم)

وہ پلٹ کر غور سے جاوید کی طرف دیکھنے لگی...... ’’دیکھئے! میں اس بار نہیں چاہتی کہ مجھے کوئی دھوکہ ہو‘‘ کہتے ہوئے پھر وہ جاوید کے دوست کی طرف مڑی‘‘ ’’آپ میرے بھائی کی طرح ہیں کھل کر بات کیجئے‘‘۔

دوست نے پہلے کھنکار کر اپنا گلہ صاف کیا پھر بولا ’’دیکھئے محترمہ! سچ بات تو یہ ہے کہ انہیں کوئی اولاد نہیں ہے۔ دوسرے ان کی بیوی ان سے لڑ جھگڑ کر اپنے میکہ چلی گئی ہے وہ آ نہیں رہی ہے یہ وہاں جا نہیں رہے ہیں اس لئے دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں‘‘۔

’’اسلام میں تو چار شادیاں جائز ہیں‘‘ پھر وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔ فضا میں جیسے گھنٹیاں سی بج اُٹھیں۔

’’لیکن قانون میں کہاں میڈم! وہ بھی سرکاری نوکر کے لئے۔! دوست ہنسنے لگا......

جاوید خاموش رہا۔

وہ سوچنے لگی...... ’’ٹھیک ہے۔ آج آپ اسکول چھوٹنے کے بعد ساڑھے تین بجے مجھ سے ملیں اکیلے ہی۔‘‘

دوست نے گھڑی دیکھی اور کہا ’’آج ساڑھے تین بجے مجھے ایک ضرورت میٹنگ میں جانا ہے آج نہیں کل ہو سکے گا۔؟

’’پھر آپ اپنا فون نمبر دے دیجئے۔ میں آپ کو اطلاع دے دوں گی‘‘۔

فون نمبر دے کر دونوں خوشی خوشی وہاں سے لوٹ آئے کہ چلو کام بن گیا۔

آفس سے چھوٹتے ہی جاوید سیدھا اپنے دوست کے یہاں گیا خبر لینے۔ دوست نے بتلایا ’’فون نہیں آیا۔ میں سارا دن آفس میں فون کا انتظار کرتا رہا‘‘۔

دو دن تک بھی فون نہیں آیا جاوید لاچار ادارے کے کرم چاری کے پاس پہنچا۔

کرم چاری نے کہا ’’ابھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ لیکن آپ کوئی فکر نہ کریں آپ چاہیں تو ایک اور فوٹو دیکھ سکتے ہیں اس سے بھی زیادہ خوبصورت اس سے بھی زیادہ اچھی‘‘۔

اس فوٹو پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے جس کو کرمچاری اس کی نظروں کے سامنے پکڑے ہوئے تھا نہیں کہتے ہوئے جاوید وہاں سے چلا آیا۔

ایک دن اور شادی کی خوشی میں بڑی مشکل سے کٹا آفس سے چھوٹتے ہی وہ سیدھا پھر اپنے دوست کے پاس گیا۔

دوست نے بتلایا۔ فون آیا تھا جواب نیگیٹو (نہیں) رہا۔

جاوید کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا ’’اگر تم اس دن اس سے مل لیتے ساڑھے تین بجے تو یہ بات نہ ہوتی‘‘۔

’’شاید وہ تمہاری قسمت میں نہیں۔ کسی اور جگہ کوشش کرو یا پھر سلمٰی کا انتظار کرو۔ دوست ہنسنے لگا......

’’سلمٰی کا نام نہ لو میرے سامنے تم سلمٰی کو نہیں جانتے۔ وہ کھوٹا سکہ ہے تم نے حاتم طائی کی اسٹوری تو پڑھی ہوگی کہ کس طرح ایک خبیث اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی ہے اور اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی میری بھی پیٹھ پر ایسی ایک خبیث سوار کرادی گئی ہے بڑوں کی طرف سے میں اسے پندرہ سال سے ڈھو رہا ہوں۔ آج کل وہ اتر گئی ہے اور قانون کی آڑ لے کر میکہ میں جا بیٹھی ہے اور مجھے ستا رہی ہے بولو میں کیا کروں تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے اسلام میں ایک بار عورت شوہر کی مرضی یا اطلاع کے بغیر گھر سے نکل جاتی ہے تو وہ طلاق کی مستحق ہو جاتی ہے‘‘ کہتے ہوئے جاوید غصہ میں دندناتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

دراصل سلمٰی کے ایسے طرز عمل نے بھی اس کے خلاف اس کے دل میں نفرت بٹھادی تھی جو دن بہ دن بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اور دوسری شادی کا خیال روز بہ روز جڑ پکڑتا چلا جا رہا تھا۔

چوتھے دن صبح وہ بے دلی سے اٹھا اور کام کاج سے فارغ ہو کر اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ شادیوں کے اشتہارات پر اب وہ نظر ڈالنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سرسری طور پر اخبار دیکھ کر اٹھا۔ آفس کا وقت ہو رہا تھا' تیار ہو کر آفس چلا گیا۔

آفس میں بیٹھے بیٹھے ہی اسے خیال آیا کہ وہ اکیلا ہی اس عورت سے مل لے اور انکار کی وجہ جان لے

[illegible]

چنانچہ پیچ وتاب کھاتا آفس سے لوٹتے ہوئے ایک ہوٹل میں بیٹھ گیا کہ ایک پیالی چائے پی کر اپنے ذہن کو پرسکون کر لے۔

چائے پی کر ہوٹل سے نکلتے ہوئے اچانک اس کی نظر روڈ کی دوسری طرف پڑی اور وہ چونک گیا۔

روڈ کی دوسری طرف وہی عورت کھڑی تھی لیکن کتنے مختلف انداز میں...... بے حد کھلے گلے کے بلاؤز میں سے اس کی پیٹھ کا بڑا حصہ کھلا ہوا تھا کمر کی بیحد نچلی سطح تک جہاں سے اور نیچے کولہوں کے بھاری ساڑی کی تنگ لپیٹ میں اور زیادہ نمایاں ہوگئے تھے۔ اس کے سامنے دو بھوکے مرد ٹھہرے ہوئے تھے۔ چوں کہ عورت کے ٹھہرنے کا انداز کچھ عجیب طرح کا تھا' بازاری تبھی اُس کے کانوں میں وہی آواز گونج گئی جو اس کے کانوں میں رس گھول گئی تھی۔ لیکن اسے لگا جلترنگ کی سی لئے میں ڈوبی ہوئی وہ آواز اس کے دماغ سے نکل کر ہوا میں اڑ گئی ہے جیسے اس کا کوئی ارتعاش تھا ہی نہیں۔

وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا --- پوچھنے کے لئے اب باقی بھی کیا رہ گیا تھا وہ بھی ایک کال گرل سے چنانچہ چپ چاپ وہ وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے دن صبح وہ حسبِ معمول اٹھا اور کام کاج سے فارغ ہو کر اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ عقد ثانی کے اشتہارات پر نظر ڈالتے ہوئے اس کا منہ بگڑ گیا --- فوراً اخبار چھوڑ کر اٹھا اور ٹہلنے لگا --- ٹہلتے ٹہلتے سوچنے لگا...... میں اب تک غلطی پر تھا۔ اب میں غلطی نہیں کرونگا۔ غلطی کو غلطی سے ضرب دینے سے تو بہتر یہ ہے کہ میں کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کروں جس کی جڑیں نہ سماج میں ہوں نہ میکہ میں۔

پھر اس نے مصمم ارادہ کر لیا اور دوسرے ہی دن ویمنس ویلفیر سنٹر گیا اور ایک قبول صورت لڑکی کو جو سماج کی ٹھکرائی ہوئی تھی اور اس کے ماں باپ کا بھی کوئی پتہ نہ تھا۔ باضابطہ رجسٹر میں خانہ پری کر کے اپنے گھر لے آیا اور اس سے شادی رچالی۔ اور سلمٰی جو اس کے حق میں بیوی سے زیادہ (Paraside) یعنی طفیلی بن کر رہ گئی تھی۔ اس کو اپنے وجود سے الگ کر ڈالا۔

اس طرح دوستو! جاوید کی کہانی ختم ہوئی اور وہ مطمئن ہو گیا کہ --- دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

اب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں دیکھئے میں کسی ادارے کا کرمچاری ہوں نہ صلح کار' قلم کار ہوں' قلم بیچتا نہیں جواب دیجئے۔ What is wrong غلط کیا ہے۔؟

ঙ্গ ঙ্গ

طلاق

> ہر گلابی پھول کے ساتھ ایک کانٹا لگا ہوتا ہے بڑا سخت جو پھول کی حفاظت کرتا ہے اور جو پھول کو شاخ سے جدا کر دے وہ کانٹے سے بھی سخت بول طلاق ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اکثر پتی اور پتنی کے درمیان وہ کی جگہ طلاق ہی ہے۔ اگر اس وہ کو نکال دیا جائے تو صرف پتی اور پتنی ہی رہ جائیں گے شاخ سے جڑے اس انتباہ کے ساتھ پھولو! ہوشیار رہو شاخ سے جڑے رہو۔

منور میاں نے بالآخر مجید کی بے جا ہمدردیوں سے تنگ آ کر انتہائی صبر کے باوجود جب کہ ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا جس سے ان کا بایاں ہاتھ اور بایاں پیر اپنے قابو میں نہیں تھا' بشیرہ کو طلاق اس طرح ہی دے ڈالی تھی جیسے انہوں نے بشیرہ کو تین بار اپنی گرج دار آواز میں گالی دی ہو تو اس کی گونج یہاں سے پاکستان تک پہنچ گئی---

پاکستان سے سہیل بھائی کا خط آیا ہم سب کے نام--- وہ خط کیا بلکہ ایک ایسا سوال بند تھا جس کی جواب دہی زیادہ تر مجید پر ہی لازم تھی۔ لیکن اس میں ہم ایک طرح سے فریق تھے جو ان کے خیال کے مطابق صحیح صحیح جواب دینے کے اہل ہو سکتے تھے جو کہ کسی حد تک صحیح نہیں تھا۔ صرف اس لئے کہ ہم بھی اوروں کی طرح اس حد تک واقف تھے کہ مجید اور بشیرہ نے اپنی شادی سے پہلے کبھی ایک دوسرے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا اور یہ بات بھی شاید غلط نہیں تھی کہ انہوں نے اپنی شادی کے بارے میں کبھی روایتی انداز میں لیلیٰ مجنوں کی طرح قسمیں وعدے بھی کیئے ہوں گے اور کاغذی گھوڑے بھی دوڑائے ہوں گے---

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب سہیل بھائی ابھی معہ بچوں اور بیوی سمیت سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ پاکستان شفٹ نہیں ہوئے تھے۔ بشیرہ کے شفٹ ہونے کا سوال اس لئے بھی پیدا نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی' اور منور میاں اس کے شوہر اس پر کسی حال راضی نہیں تھے کہ ساس اور سسر کے ہمراہ وہ بھی معہ بیوی بچوں سمیت پاکستان شفٹ ہو جائیں کیوں کہ ان کا یہاں لاریوں کا خاصہ کاروبار تھا جو خوب چل رہا تھا۔

معلوم نہیں بعد میں جو کچھ ہوا وہ کس کے حق میں اچھا اور کس کے حق میں بُرا ہوا' یہ تو اوپر والا ہی جانے' لیکن جب منور میاں نے مجید کی بیجا ہمدردیوں سے تنگ آکر بالآخر ایک دن بشیرہ کو طلاق دے ہی ڈالی تھی تو ہندوستان سے لےکر پاکستان تک سبھی گھروں میں ہلچل کا مچ جانا ضروری تھا جن کے رشتے آپس میں ہر دو طرف ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

دراصل اس کی ابتداء اس وقت ہی شروع ہو چکی تھی جب بشیرہ کی شادی اس کے چچیرے بھائی منور میاں کے ساتھ ہوگئی اور مجید کی شادی ایک دوسرے امیر گھرانے میں ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی انوری سے ہوگئی۔اس کے باوجود مجید کا بشیرہ کے یہاں آنا جانا باقی رہا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ مجید کو شادی کے بعد کوئی اولاد نہیں ہو سکتی تھی۔ جبکہ شادی کے چار سال کے قلیل سے عرصہ میں ہی بشیرہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی اس لئے مجید' جو بچوں کو بے حد چاہتا تھا خود کو اولاد نہ ہونے کے سبب وہ بشیرہ کے بچوں کو چاہنے لگا تھا۔ اس میں لوگوں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ منور میاں نے بھی اس بارے میں کبھی کوئی شک وشبہ نہیں کیا۔ان کا خیال تھا تو یہ کہ مجید کو کوئی اولاد نہیں ہے۔اس لئے ہمارے یہاں وہ آتا ہے تو آنے دو۔اس میں بُرائی کی کیا بات ہے مجید آخر ہمارا رشتہ دار ہی ٹھہرا۔اس لئے اس سے کوئی غیر غلط بات یا غیر غلط برتاؤ کے تعلق سے سوچنا بھی فضول ہی ہوگا۔ اس طرح منور میاں کو ہی مجید کے آنے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا تو بھلا بشیرہ کیسے زبان ہلا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بھی خاموش ہو رہی اور اپنی خوش حال زندگی میں مگن۔

لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جگہ جگہ ٹرانسپورٹ کھل گئے اور آر۔ٹی۔اے۔کی بالادستی ہر معاملے میں رکاوٹ بننے لگی تو منور میاں کو لاریوں کا دھندہ گھاٹے کا سودا لگنے لگا۔ پھر قبل اس کے کہ مزید نقصان اٹھانا پڑتا انہوں نے فوراً لاریوں کو اونے پونے داموں فروخت کر کے باہر جانے کی ٹھان لی اور چلے بھی گئے--

منور میاں کب باہر چلے گئے۔ان پر فالج کا حملہ کب ہوا اس کی اطلاع ہم کو مجید کے ذریعہ سے ہی ہوئی چونکہ مجید کا آنا جانا بشیرہ کے یہاں منور میاں کے باہر چلے جانے کے باوجود بھی باقی تھا۔

غالباً منور میاں کے باہر چلے جانے کے دوسرے ہی سال ایک دن مجید نے آکر ہم کو یہ اطلاع بھی دی کہ منور میاں باہر سے واپس آرہے ہیں۔ چونکہ ان پر فالج کا اتنا شدید حملہ ہوا ہے کہ وہ کام کرنے کے بالکل قابل نہیں ہیں۔

پھر وہ باہر سے کب واپس آئے اس کی اطلاع بھی مجید کے ذریعہ سے ہوئی تو میں ان سے ملنے ان کے گھر چلا گیا--واقعی ان کی حالت بے حد خراب تھی اور قابل رحم میں نے انہیں ہمت دلائی اور انہیں ایک ایسے حکیم کا پتہ بتلایا جو فالج کے کیسوں کو درست کرنے میں بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ مسلسل علاج کے دوران ان کے مرض میں کچھ افاقہ بھی ہوا تو صرف اتنا کہ وہ سہارے کے ذریعہ سے چلنے بھرنے کے قابل ہو گئے ایک دن مجید نے آ کر ہم کو یہ بھی بتلایا کہ اب وہ کام کاج کے سلسلہ میں باہر بھی نکل رہے ہیں--- پھر نہ جانے کیا ہوا کہ مجید کا وہاں آنا جانا کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی ابتداء اس بات پر ہوئی جو بظاہر معمولی سی تھی یعنی مجید نے ہمیشہ کی طرح جب کہ منور میاں باہر رہتے تھے' سنیما کے ٹکٹ لئے وہاں پہنچا تھا اور بشیرہ کے ساتھ بچوں کو بھی سنیما دیکھنے کے لئے تیار رہنے کو کہا تھا تو منور میاں نے مجید کو بری طرح جھڑک دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ عورتوں کو سینما دیکھلانے کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجید کو سخت الفاظ میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ آئیندہ سے وہ کبھی بشیرہ اور اس کے بچوں سے ملنے کی کوشش بھی نہ کرے اور نہ ہی اس گھر میں قدم رکھے۔

بشیرہ نے تو اس وقت کچھ نہ کہا تھا لیکن بعد میں اس نے منور جہاں سے کافی جھگڑا کیا--- جھگڑے کی نوعیت کیا تھی یہ تو معلوم نہ ہو سکا لیکن اس کے بعد منور میاں کے تئیں بشیرہ کا رویہ دن بہ دن خراب تر ہوتا چلا گیا۔ جس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ منور میاں کی کئی مہینوں کی عدم موجودگی میں کیونکہ مجید نے ہی گھر کا چھوٹے سے چھوٹا بڑے سے بڑا کام نپٹایا تھا اس لئے بھی شاید وہ اس سخت کلامی سے نالاں تھی۔

بہر حال جو کچھ ہوا وہ اچھا ہی ہوا اور جس کو بہت پہلے ہی ہونا چاہیے تھا۔ اب اسے منور میاں کی نیک نیتی' صاف دلی' اور کھوٹ کھپٹ سے مبرا دل کہیے کہ انہوں نے مجید کے تعلق سے کبھی کوئی غیر غلط بات کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی تو ایک طرح سے یہ بشیرہ کا ایسا طرز عمل تھا جس کے لئے وہ مطمئن اس لئے بھی تھے کہ چہرہ تو دل کا آئینہ ہوتا ہے اور دل کے اس آئینہ میں انہوں نے ہمیشہ اپنی ہی تصویر دیکھی تھی۔

لیکن جب منور میاں نے بشیرہ کو طلاق دے ڈالی تو یوں ہی معلوم ہوا کہ منور میاں نے بھرے پستول کی نال سے تین گولیاں دندناتی ہوئی بشیرہ کے جسم میں اس طرح داغ دیں کہ اس سے بشیرہ کی ازدواجی زندگی کا سارا وجود ہی بھک سے ہوا میں اڑ گیا۔

یہ ایک ایسا انتہائی اقدام تھا جو کسی طرح بھی دانشمندانہ نہیں کہلا سکتا چونکہ بشیرہ سے ان کو چار بچیاں تھیں جن میں سے بڑی لڑکی جوانی کی دہلیز میں قدم رکھ رہی تھی۔

اس المناک حادثہ کی اطلاع ہم تک ہمارے بہنوی سعادت نے پہنچائی تو کتنی ہی دیر تک ہم سب گنگ رہے اور منور میاں کی حالت پر افسوس کرنے لگے جن پر فالج کے حملے سے چلنا پھرنا تک دوبھر تھا۔ ایسے وقت انہیں ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اور ایسا سہارا انہیں ان کی بیوی سے بڑھ کر اور کون دے سکتا تھا۔

بات بھی کتنی عجیب ہے کہ منور میاں باہر کے ممالک میں اچھی آمدنی کی توقع میں گئے تھے لیکن وہاں سے انہوں نے جو کچھ کمایا وہ سب بیماری کی نذر ہو گیا اور وہاں سے جو دھن لے کر وہ لوٹے اس نے انہیں نہ صرف ناکارہ بنا ڈالا تھا بلکہ گھر بار سے بھی بے گانہ کر دیا۔

ممکن ہے منور میاں کا یہ انتہائی اقدام گرما گرمی میں بظاہر انہیں ذہنی سکون بخش دیا ہوگا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آدمی اپنے ماضی کو اتنی جلدی بھلا بیٹھے۔ چنانچہ جب سعادت ان کے یہاں پہنچے تو وہ بالکل بچوں کی طرح ان کے سامنے رو اٹھے تھے۔

سعادت نے بتلایا:

''ایک لمحہ کیلئے تو میں پریشان ہو گیا۔ کیونکہ مجھے ان کے درمیان ہوئی طلاق کی اطلاع ہی نہیں تھی۔''

وہ عرفے کی ہی شب تھی اور اس کے دوسرے دن عید' جب منور میاں نے رو رو کر اپنی دستانِ الم سعادت کو سنائی تھی۔

مجھے معلوم تھا سعادت بھائی۔ اور میں ایسا اقدام نہیں بھی اٹھاتا لیکن میں بشیرہ سے تنگ آچکا تھا دوسرے معنوں میں' میں اس سے تنگ آچکا تھا۔ جس کی صرف شادی کی بات بشیرہ سے چھڑی تھی۔ لیکن بشیرہ کے والدین اس پر کسی حال راضی نہیں تھے کہ بشیرہ کی شادی مجید سے ہو۔ معلوم نہیں کیوں۔ یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایک ہی گھر میں دو بیٹیاں دینے کے حق میں نہیں تھے۔ جیسا کہ میں نے بہت پہلے یہ بات اڑتے اڑتے سنی بھی تھی۔ لیکن مجھے تو اس کی وجہ یہی نظر آئی تھی کہ مجید کی اس وقت کوئی اچھی ذرائع آمدنی نہیں تھی۔ سوائے سینما کی گیٹ کیپری کے۔ بعد میں وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ چونکہ مجید بیمار رہنے لگا تھا تو ان کی نظروں میں' میں ان کے نزدیک اچھا داماد تھا۔ میرے پاس اس وقت لاریاں تو نہیں تھیں لیکن کاروبار اچھا تھا۔ اس کے باوجود میں نے شادی سے پہلے چاہا کہ ایک بار مجید سے مل لوں۔

چنانچہ میں نے ایک دن مجید سے اس بارے میں بات چیت کے لئے اسے ایک ہوٹل میں دعوت دی۔ وہاں میں نے اس سے کھلی کھلی بات کی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھو! اگر تم بشیرہ سے شادی کرنے کے حق میں ہو تو بولو میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ تب اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ نہیں بشیرہ تمہاری ہی امانت ہے۔ ہاں میں نے اسے چاہا ضرور ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ میں جس کو چاہوں اس سے میری شادی بھی ہو جائے۔ اب تمہاری شادی اس کے ساتھ ہو رہی ہے تو میری چاہت کا رجحان ویسا ہی رہے گا یہ فضول سی بات ہوگی۔ اب بشیرہ کو میں جس نظر سے دیکھوں گا اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ چونکہ بشیرہ میرے لئے کوئی غیر نہیں ہے کہ خدانہ خواستہ میں اس کا بُرا چاہوں۔ اور پھر منور

ائی آپ جیسے صاف گو انسان کی عزت میرے دل میں اس لئے بھی بڑھ گئی ہے کہ آپ نے مجھ پر الزام
اشی کی بجائے بات کی صفائی کے لئے پیش کش کی۔
''ہاں سعادت بھائی' یہ ایسی ہی گفتگو تھی جس پر میں ایمان لے آیا اور میں نے مجید کی گھر میں آمدو
نت پر بھی کوئی پابندی نہیں رکھی۔ بلکہ میں نے اپنی غیر ممالک کو روانگی کے وقت خاص طور پر اسے دعوت
ی اور اسے کہا کہ دیکھو! میں دو چار سال کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ اس دوران چونکہ گھر میں مرد کی کوئی
ورت نہیں ہے اس لئے تم گھر کا پورا پورا خیال رکھنا اور بچوں کی پڑھائی کی طرف بھی خاص توجہ دینا۔ اس
کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا اور میں باہر چلا گیا لیکن وہاں مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو دو سال کے اندر ہی واپس
وٹ آیا۔ لیکن شاید یہ اچھا ہوتا کہ میں وہیں پیوند خاک ہو جاتا تو مجھے یہاں آنے کے بعد ایسے حالات سے
لجھنا نہ پڑتا اور میرا ذہنی سکون برباد نہ ہوتا۔'' یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے بشیرہ کا طرز عمل مجھ جیسے
پاہج کے ساتھ جیسا کہ پہلے تھا' ویسا باقی نہ رہا' شاید وہ مجھے ایسا عضو معطل سمجھنے لگی تھی جسے کاٹ کر پھینک
ینا چاہیے۔
''بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے باہر رہنے کے دوران مجید پابندی سے یہاں آتا رہا۔ گھر کے
اہری کاموں کو نپٹانے کے علاوہ وہ بچوں کو پڑھاتا بھی رہا۔ معلوم نہیں اس حد تک مجھے کہاں تک اس کا شکر
گزار ہونا چاہیے خیر یہ بھی میرے لئے بچوں کی صورت کی وجہ سے کچھ ناگوار بھی نہیں گزرتا لیکن بشیرہ کا طرز
ل اور اس کے وہ چبھتے ہوئے جملے کہ ایسی اپاہج زندگی بھی کوئی زندگی ہے مجھ سے برداشت نہ ہو سکے۔
ر میں اس پر حق بہ جانب بھی ہوں کہ میری سوچ کا انداز بدل گیا تھا تو یہ صرف اور صرف اس لئے کہ بشیرہ
کی مجھ سے لاپرواہی اس کا نتیجہ تھی۔ جس کو میں کئی اور دوسری باتوں کے باوجود برداشت نہ کر سکا اس سے
چھا تو یہی ہوتا کہ---خیر جانے دو اب اس کو دہرانے سے کیا فائدہ''۔
''ایک دن جب میں بڑی مشکلوں سے علاج کے بعد کچھ کچھ چلنے پھرنے کے لائق ہو گیا تھا۔ اور
پنے کاموں کو بھی باہر نکلنے لگا تھا کہ واپس گھر لوٹا گھر پر قفل پڑا ہوا تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا چونکہ میں نے کئی بار
شیرہ کو اس کی تاکید کی تھی کہ اگر تم کو رشتے داروں کے یہاں جانا ہو تو کم از کم باہر کے دروازے کی کنجی بازو
کے گھر میں رکھا کے جاؤ۔ لیکن اس نے معلوم نہیں کیوں ایسا کبھی نہ کیا۔ اس دن بھی نہیں---''
''اس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی میں گھر کے باہر دروازے پر قفل پڑا ہوا دیکھ کر پانی میں بھیگتا ایک
انبا فاصلہ طے کرتا وہاں پہنچا۔ جہاں بشیرہ آرام سے مسہری پر پڑی ہوئی سو رہی تھی۔ میں سیدھا اس کے
قریب پہنچا۔ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ میں سرتاپا پانی سے شرابور سردی سے کپکپا رہا تھا اور میرے

دماغ کی نسوں میں خون تیزی سے گردش کرتا ہوا خیالات میں ایک ہیجان سا پیا کیئے ہوئے تھا۔ اس وقت میں اپنے انتہائی صبر و تحمل کے باوجود اپنے غصے کو قابو میں نہ رکھ سکا اور بشیرہ کو نیند سے جگا کر' قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کچھ کہتی میں نے تین بار اُسے ایسی گالی دی جس کو سن کر وہ سکتے کی حالت میں آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھتی رہ گئی ---''

''پھر میں اسی وقت وہاں سے الٹے پاؤں اپنے گھر لوٹ آیا ہوں لیکن مجھے اس کا بھی خیال نہ رہا کہ میں وہاں بشیرہ کے پاس گھر کی کنجیاں لینے گیا تھا۔ لیکن کنجیاں لینے کی بجائے میں نے بشیرہ کو جو دے آیا۔ اس سے مجھے کچھ ایسا ہی ذہنی سکون ملا جیسے بچپن میں دل بھر کر رو لینے کے بعد پہنچتا ہے۔''

یوں قصہ تمام ہونے کے بعد سعادت نے بتلایا۔ میں اس المناک حادثے کو منور میاں کی زبانی سن کر انہیں تسلی دے کر وہاں سے لوٹ آیا۔ کیونکہ منور میاں کی حالت اس وقت ایک ایسے مسافر کی سی تھی جس کا سارا اثاثہ دوران سفر لوٹ لیا گیا ہو''۔

اس دوران مجید مجھ سے کئی بار ملا لیکن اس بارے میں اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور نہ ہی کچھ بتلایا تو مجھے خیال ہوا کہ کہیں اسے اس حادثے کا کوئی علم ہی نہ ہو۔

ایک دن میں اس جذبے کے تحت کہ دیکھیں مجید کے چہرے پر اس بات کا کیا اثر ہوتا ہے اس سے یہ بات کہہ ہی ڈالی اور میرا یہ اندازہ صحیح ہی نکلا۔ مجید کو اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ کیونکہ بشیرہ کی طلاق کی بات سن کر وہ بری طرح چونکا تھا اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا --- لیکن اس کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی جس کا اظہار کافی الحال اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے لب اس طرح سے بند تھے جیسے ان پر قفل پڑ گیا ہو۔

اور جب قفل کھلا تو اس نے صرف اتنا کہا۔ ''میں نے ایسا تو کبھی نہ چاہا''۔

''میں نے اُسے سختی کے ساتھ ڈانٹ دیا:

''تم نے کیا چاہا اور کیا نہیں چاہا۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔ لیکن اس وقت معصوم زندگیوں کا سوال ہے۔ معلوم ہے اب جبکہ منور میاں لاچار ہو چکے ہیں ان معصوم زندگیوں کا کیا ہوگا۔ تمہیں شرم آنی چاہیے تھی کہ تم نے اپنی نادانیوں سے ایک گھر کو تباہ کر کے رکھ ڈالا''۔

تھوڑی دیر تک مجید یہ سب سنتا میرے سامنے سر جھکائے کھڑا رہا --- پھر اُٹھ کر چلا گیا۔

دوسرے دن صبح صبح پھر وہ میرے پاس آیا اور بتلانے لگا۔

میں بشیرہ کے یہاں گیا تھا کہ اس سے مل لوں اور اس تجویز کو اس کے سامنے رکھوں کہ میں اس ذمہ

داری کو نبھانے لئے تیار ہوں اس کے لئے میں ہی ذمہ دار ہوں---لیکن بشیرہ نے نہ صرف میری بات نہیں مانی بلکہ وہ میرے سامنے بھی نہیں آئی۔ دوسروں سے یہ کہلا بھیجا کہ میں اس کے پاس آئندہ کبھی آنے کی کوشش بھی نہ کروں''۔

بشیرہ کی طرف سے یہ ایسا کرارہ جواب تھا جو ایک چانٹے سے کم نہیں' جس کے نشان گرچہ مجید کے گال پر تو نہیں ہاں اس کے دل پر ضرور نقش ہو گئے ہوں گے---اس کے بعد ہی بشیرہ کی والدہ کی طرف سے خط آیا کہ بشیرہ کو معہ بچوں کے فوراً پاکستان بھیج دو۔

پھر بشیرہ معہ بچوں کے ماں کی ہدایت کے مطابق پاکستان چلی گئی۔

غالباً اس کے دو تین ہفتوں بعد ہی جو خط سہیل بھائی کے یہاں سے آیا وہ ایک خط سے زیادہ ایسا سوال بند تھا جس کی جواب دہی مجید پر ہی لازم تھی۔ لیکن اس میں ہم سب ایک طرح سے فریق تھے جو ان کے خیال کے مطابق صحیح صحیح جواب دینے کے اہل ہو سکتے ہیں۔

یہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط اس بحث میں نہ پڑتے ہوئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ایک ایسا ناگہانی حادثہ تھا جس کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا' نہ مجید' نہ بشیرہ' نہ منور میاں۔ کیونکہ حادثے کب' کیوں اور کیسے ہوتے ہیں تو اس کا صحیح جواب یہی ہوگا کہ یہ لاپرواہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں اس لاپرواہی کے لئے کون ذمہ دار ہیں۔ کیا بشیرہ' کیا مجید؟ کیا منور میاں؟......تو میں ٹھیک طور سے اپنی انگلی کسی ایک طرف اٹھا بھی نہیں سکتا دراصل میری انگلی سب کی طرف اٹھ کر نیچے گر جاتی ہے......

اس حادثے کے بعد منور میاں سے میری ملاقات آج تک بھی نہیں ہو سکی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ایک ایسی ذہنی اذیت میں مبتلا ہیں۔ جس سے چھٹکارہ ان کے لئے ممکن نہیں۔ دراصل ایک طرح سے سب ہی اس اذیت میں گرفتار ہیں۔ جن کے رشتے ہر دو طرف دوریوں کے باوجود آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

اس خط کے بعد جو کہ ایک سوال بند تھا پھر سہیل بھائی کا کوئی اور خط نہیں آیا۔ لیکن کئی مہینوں بعد پاکستان سے آئے ہوئے کچھ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ سہیل بھائی پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔

مجید کا حال اس وقت یہ ہے کہ آج تک بھی وہ لاولد ہے۔ اگرچہ وہ بشیرہ اور منور میاں کے تعلق سے زبان سے کچھ کہتا نہیں لیکن پچھتاوے کی دھند اس کے چہرے سے ہٹتی نہیں۔ جیسے یہ دُھندا ہمیشہ کے لئے اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی ہے۔

نفسیاتی معالج

نفسیاتی الجھن کوئی وائرس کا مرض نہیں۔ لیکن پھر بھی وائرس کی طرح پوشیدہ عقلی تہوں میں چھپا محوِ استراحت رہتا ہے اور جب جاگتا ہے تو جسم میں ایک ہیجان سا بپا ہو جاتا ہے۔

خان مجھ سے عمر میں کافی چھوٹا تھا' لیکن وہ مجھ سے زیادہ عمر کا لگتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی جوانی میں اعتدال پسندی سے کام نہیں لیا تھا' وہ عورتوں کے معاملہ میں بڑا فراخدل واقع ہوا تھا۔ یعنی ایک ہی رات میں وہ کئی کئی عورتوں پر اپنی جوانی لٹا دیتا تھا' اپنی صحت بے دریغ استعمال کرتا تھا' جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات کافی کمزور بھی ہو جایا کرتا تھا' اس وقت وہ بے حد پچھتاتا کہ فلاں عورت سے ملنے کے بعد اُسے بیماری کے جراثیم لگ گئے ہیں اور فی الحال وہ کسی عورت کے قابل نہیں ---! اور میں اُسے مشورہ دیا کرتا کہ دیکھو میاں! چھوڑو اپنی ان بُری عادتوں کو' شادی کرلو اور ایک بیوی کے ہو کر رہو' ورنہ کسی دن کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔

وہ قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے کہتا "ارے میاں چھوڑو۔ کیا ڈاکٹر مر گئے ہیں جو میرا علاج نہیں کریں گے۔

میں اُسے بتلاتا کہ بعض اوقات' بعض مرض لاعلاج بھی ہو جاتے ہیں۔ ایسے کئی کیس میں تمہیں بتلا سکتا ہوں جن میں مرد تقریباً ناکارہ ہو کر رہ گیا ہے۔"

وہ کہتا --- "اس وقت میں اپنے آپ کو گولی مارلوں گا' زندہ نہیں رہوں گا۔ میں تو عورتوں کے لئے جیتا ہوں' عورتوں کیلئے ہی مروں گا۔ اگر عورت کے قابل نہ رہا تو زندگی کس کام کی --؟"

میں کیا جواب دیتا اس کی ان بے تکی باتوں پر خاموش ہو جایا کرتا۔

پھر ایک دن ہوا یہ کہ اس کی شادی ہوگئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماں باپ نے مل کر اُس کو اس کی ان بُری عادتوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے اس کی شادی کر دی۔ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ فوج میں بھرتی ہو کر سرحد پر چلا گیا۔ اور وہاں سے کئی سالوں تک واپس نہ آسکا۔ کیوں کہ پڑوسی ملک سے جنگ چھڑ گئی تھی۔

جب جنگ کے شعلے ذرا سرد ہوئے تو چھٹی پر لوٹا۔ اور آتے ہی پھر کوٹھوں کے چکر لگانے لگا۔ میں ہر

بار اس سے کہتا ''خان! اب چھوڑو بھی اپنی ان بُری اور گندی عادتوں کو' تمہاری شادی ہو چکی ہے' کیوں نہیں اپنی بیوی کے ساتھ اپنا وقت گزاتے۔ بجائے اس کے گندی اور غلیظ رنڈیوں کے ساتھ گذارتے ہو''۔

وہ کہتا کہ--- ''کون کہتا ہے کہ رنڈیاں گندی اور غلیظ ہوتی ہیں' کبھی تم نے ان رنڈیوں کو دیکھا بھی ہے قریب سے؟ وہ کتنی صاف ستھری اور سجی سنوری رہتی ہیں باہر سے' اب اندر سے اپنا کیا تعلق وہ تو اپنا یار دیکھتا ہے اندکا معاملہ ہم تو رنڈیوں کو باہر سے خوب پیار کرتے ہیں۔

ثبوت کے طور پر وہ مجھے بھی اکثر رنڈیوں کے کوٹھوں پر لے جاتا۔ جہاں رنڈیاں حقیقت میں اس طرح ہی سجی ہوئی بیٹھی' کھڑی یا لیٹی رہتی ہیں کہ ان کو دیکھ کر دل للچانے لگتا۔

جب تک وہ یہاں چھٹی پر رہتا کوئی کوٹھا' کوئی رنڈی اس سے نہ چھوٹتی ڈیوٹی جوائن کرنے کے لئے ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے وہ ان عورتوں کو یاد کر کے بڑا غمگین اور اُداس ہوا کرتا اور کہتا۔

''سرحد پر تو عورت دیکھنے کو بھی نہیں ملتی یار...... اُسے گلے سے لگانا تو دور کی بات رہی۔ بعض وقت تو جی چاہتا ہے کہ ٹھائیں ٹھائیں گولیاں برساتا' دشمن کے دستوں کا صفایا کرتے ہوئے اُس کے ملک میں گھس جاؤں اور وہاں سے بہت ساری عورتیں اُٹھالاؤں۔!''

میں اپنے ملک کے حق میں دعا دیتے ہوئے جب کہ ٹرین پلیٹ فارم چھوڑنے کے لئے سیٹی دے رہی ہوتی۔ اس سے کہتا کاش تمہاری یہ خواہش بھی ایک دن پوری ہو جائے۔

☆☆☆

تیسری بار جنگ چھڑ کر جب اُس کے شعلے ذرا سرد ہوئے تو وہ پھر چھٹی پر گھر لوٹا--- لیکن اس بار اس میں وہ شوخی نہیں تھی--- وہ کافی بدلا بدلا سا لگ رہا تھا جیسے اُس کے جسم میں ہر وقت اُٹھتی ہوئی امنگوں' ولولوں اور خواہشات کا خاتمہ ہو گیا ہو' کیوں کہ وہ کافی بجھا بجھا سا لگ رہا تھا اُس نے داڑھی بھی بڑھا رکھی تھی اور اُس کے ایک ہاتھ میں تسبیح بھی آ گئی تھی وہ پنج وقتہ نمازی بن گیا تھا۔

میں نے سوچا--- چلو یہ اچھا ہوا کہ وہ شیطان سے انسان بن گیا ہے' کیونکہ یہاں آنے کے بعد اُس نے کبھی کوٹھے کا رُخ بھی نہیں کیا تھا۔ ایک دن مہندی سے گزرتے ہوئے جو بازاری عورتوں کا اڈہ ہے' جہاں عورتیں دروازوں میں اور چوکھٹوں پر بڑی بے شرمی سے کھڑی یا بیٹھی ہوئی رہتی ہیں۔ اس بازار سے گزرتے ہوئے اُس نے بڑے زور سے لاحول پڑھی اور فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا تھا۔ جہاں سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔

مجھے اس کی اس بدلی فطرت پر خوشی بھی ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں حیران تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے' چنانچہ

رہا تھا' جس میں وہ مصنوعی چیز پڑی رہتی تھی۔ اب اس کے چہرے پر داڑھی بھی نہیں تھی اور نہ ہاتھ میں تسبیح ...... مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے میرے قریب آیا اور کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''کہو یار کیسے ہو۔؟''

''میں نے بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' تم اپنی سناؤ۔۔''

''اپنی کیا سنائیں' تم میرا حلیہ دیکھ کر ہی سمجھ گئے ہونگے کہ اب وہ مصنوعی چیز میرے بیگ میں ہوگی نہیں'' کہتے ہوئے اُس نے بیگ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''ہاں۔۔ہاں! میرا مطلب یہی تھا میں نے جلدی سے کہا۔۔لیکن...... لیکن یہ سب ہوا کیسے۔

''ہوا کیسے! وہ زور زور سے ہنسنے لگا'' یہ سب کیا تم یہیں پوچھ لوگے۔ چلو کسی ہوٹل میں چلتے ہیں'' کہتے ہوئے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ہوٹل میں لے گیا۔

ہوٹل میں کافی کا آرڈ دے کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ پھر ہنسنے لگا۔ ''آخر ایک رات میری بیوی کو پتہ چل ہی گیا۔'' کہتے ہوئے اُس نے کندھے سے بیگ نکال کر اُسے ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کی کمر میں مسلسل درد رہنے لگا تھا اور اس مصنوعی فعل سے اُسے کافی تکلیف ہونے لگی تھی۔ اُس رات اندھیرے میں اُس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر اس مصنوعی چیز کو پکڑ ہی لیا اور نفرت سے اُسے جھٹک دیا۔ ''آخر تمہیں اس چیز کی ضرورت ہی کیوں پیش آ گئی۔ تمہارے پاس تو اس سے زیادہ شاندار اصلی چیز موجود ہے' جو شائد دنیا کے کسی بھی مرد کے پاس نہیں۔۔۔'' کہتے ہوئے اس نے اس مصنوعی چیز کو میری کمر سے کھول کر اُسے باروچی خانے میں لے گئی اور اس کو گیس کے چولہے پر رکھ کر چولہے کو جلا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مصنوعی چیز اکڑ کر ربڑ کی چراند چھوڑتے ہوئے جل گئی اور ایک لگدی کی شکل میں ہو گئی۔ پھر وہ چمٹے سے پکڑ کر اس لگدی کو کھڑکی سے باہر پھینک رہی تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے ذہن کی تہہ سے ایک برقی رو بڑی تیزی سے نیچے اُتری اور کمر سے ہوتی ہوئی ناف کے نیچے آ کر ٹھہر گئی۔ اور اس میں اس طرح کا مسلسل اضافہ ہوتا رہا کہ میں نے اپنے اندر جاگی اس قوت کو حیرت سے اُبھرتے دیکھا جو تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں کس طرح صرف اس کی باتوں سے ہی جو اس نے میری تعریف میں کہی تھیں' میرے اندر ایک ہیجان سا بپا ہو گیا تھا کہ برف کی طرح سرد میرے جسم کے اندر لاوا کھول اُٹھا اور وہ تیزی سے سنگلاخ زمین پھاڑ کر اُبلنے لگا۔ اور میں نے اس کو یہ موقع دیئے بغیر ہی کہ وہ مجھ کو پلنگ پر لے جاتی' باورچی خانے ہی میں میں اس کے ساتھ اصلی فعل میں مشغول ہو گیا۔

کافی آ گئی تھی۔ میں نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''ناقابلِ یقین...... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ ناراض ہو گیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم یقیناً یہی بات کہو گے' کیوں کہ کسی کو بھی میری بات پر یقین نہیں آئے گا۔" اُس نے کافی کی پیالی نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے...... ایسے واقعات بعض اوقات ہی پیش آتے ہیں اور انسانی ذہن ان کو قبول کرنے میں پس و پیش کرتا ہے۔

"ہاں --!" اُس نے دوبارہ ٹیبل پر سے پیالی اُٹھالی۔

"اچھا چلو! چلتے ہیں۔ بھابی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی" میں کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

"اب تو اس کو میرا اور مجھ کو اس کا ہی انتظار رہنے لگا ہے" کہتے ہوئے وہ بھی پیالی سے کافی کا آخری سپ لیتے ہوئے پیالی نیچے رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اب تو تمہیں دوسری عورتوں کا انتظار نہیں رہتا ہوگا --؟" میں نے ہوٹل سے نکلتے ہوئے' ہنس کر اس سے معلوم کیا ---!

"نہیں۔ میں نے اب توبہ کر لی ہے کہ اب کبھی کسی غیر عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔" کہتے ہوئے وہ بھی ہنسنے لگا۔

پھر خان جب مجھ سے وداع لے رہا تھا تو میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔

انسانی جذبات بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ بعض اوقات اُن پر ایک زبردست ہتھوڑا بھی اثر انداز نہیں ہوتا اور بعض اوقات وہ ذرا سی ٹھیس پر بھی آبگینہ کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں ---! خصوصاً جنسی جذبات کے معاملے میں انسان کو بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے --- وہ ذہن کی یکسوئی چاہتے ہیں۔ یہاں کسی بھی قسم کی گڑبڑ یا بداعتدالی بھیانک نتائج پیدا کر دیتی ہے۔

کہتے ہیں لیلیٰ کالی تھی اور مجنون گورا۔ تاہم محبت میں ایسی دیوانگی ہی کچھ اور ہے۔ بلکہ یہ سبق ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ اسی سبق کا محرک ایک تحریک ہے جو تلنگانہ موؤنٹ سے منسوب تھی اور ہے جس میں دو دل سرخ آنچل یا سرخ پرچم تلے ملے۔ آج کئی سالوں بعد وہ تحریک علحدہ ریاست تلنگانہ سے موسوم ہے۔ اس کا پرچم آنچل جیسا سرخ ہی ہے۔ ایسا ہی ہے اس کا آغاز۔

سوامی اور سجاتا کے تعلقات کے بارے میں میری پچھلی معلومات جو کچھ ہیں وہ یہ کہ وہ اپنے کالج کے زمانے سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ سجاتا کے قد و قال نہایت ہی بچکانہ تھے اور وہ دبلی پتلی کانٹا تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی رنگ گندمی لیکن چہرہ اتنا پُرکشش کہ بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ سوامی موٹا تازہ پستہ قد کا گورا گمٹا برہمن تھا اور برہمن ہی لگتا تھا۔ جب کہ سجاتا کا تعلق تھا تو ہندو گھرانے سے لیکن نچلی ذات سے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ریاست میں نان ملکی تحریک زوروں پر تھی۔ اس تحریک میں ان دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا' نعرے بھی لگائے تھے اور کالج کے کھلے گراؤنڈ میں دیگر لڑکوں کے ساتھ بھوک ہڑتال پر بھی بیٹھے تھے...... اُن دنوں میں اُس کالج میں بہ حیثیت سپرنٹنڈنٹ کارگذار تھا اور سوامی میرا بھتیجہ اس تحریک کا ذکر میں اس لئے بھی یہاں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تحریک میں ہی خیالات کی طرح ان کے دل بھی آپس میں مل گئے تھے۔ لیکن مسئلہ شادی کا تھا جو کسی حال بھی ممکن نہیں تھا۔ چونکہ سوامی کے پتا کو میری توسط سے اس بات کا پتہ چلا تھا تو انہوں نے سوامی کو اپنے پاس بلا کر ناراضگی سے کہا تھا:

''تمہیں معلوم ہے ہمارا خاندان کتنا بڑا ہے۔ ہندو دھرم میں ہماری کتنی عزت ہے' ساکھ ہے۔ اس عزت اور ساکھ کو کیا تم یوں ہی مٹی میں ملا دو گے۔ ہماری برادری میں ہماری ناک کٹواؤ گے۔ معلوم ہے اس لڑکی جس کے ساتھ تم رہ رہے ہو اس کی ذات کیا ہے۔ شرم کرو سوامی شرم کرو۔ اس سے پہلے کہ تم کوئی اور قدم اٹھاؤ میں تمہیں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ اس سنسار میں یا تو تم رہو گے یا میں''۔

سوامی سر جھکائے یہ سب سنتا رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا تھا اس کے گلے میں پڑا جینو اس کے لئے پھانسی کا پھندا ہے۔ جس کو وہ توڑ بھی تو نہیں سکتا۔

سجاتا کے باپ نے سجاتا سے اس بارے میں کیا کہا تھا اس کا تو مجھے کوئی علم نہیں لیکن کچھ دنوں بعد میں نے سنا کہ سجاتا کی شادی اس کی اپنی ذات برادری میں ایک پڑھے لکھے نوجوان سے ہوگئی جو سرکاری ملازم ہے۔

ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ سوامی کی شادی بھی' ماتا پیتا کی مرضی سے برادری ہی میں ہو جاتی' لیکن ایسا ہوا نہیں...... بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنی شادی کو ہمیشہ ٹالتا رہا ہے۔

وہ ایسا کیوں کر رہا ہے مجھے اس کا جواب جلد ہی مل گیا۔

ایک دن......

ہولی کا رنگوں بھرا تیوہار تھا اور مجھے تعطیل میں گھر پر ہی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ آتے ہی کسی نے مجھ پر ڈھیر سارا لال رنگ انڈیل دیا۔ دیکھا تو پہچان نہ سکا...... لال ساڑی میں وہ مجھے اجنتہ ایلورہ کی ایک مورتی لگی یا رشیوں منیوں کی تپسیا کو بھنگ کرنے والی کوئی اپسرا۔

میں نے کہا'' بیٹی! اچھا ہی ہوا کہ تم نے مجھ پر رنگ انڈیل دیا۔ ورنہ میں تو رنگوں کے ڈر سے گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ یہ میری غلطی تھی۔

اس نے جھٹ جھک کر میرے پیر چھوئے۔ میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کہ دعا دی۔'' سدا خوش رہو۔ بھگوان تمہیں ہر حال میں خوش رکھے۔''

یہ کہہ کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر یہ ہے کون۔ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ کیوں کہ اس کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔

'' آپ نے اسے پہچانا نہیں۔ یاد کرو۔ شانتی جو میری بیوی ہے مودی خانہ کے دروازہ میں کھڑی ہنس رہی تھی۔ کیا آپ نے کبھی اس سے فیس نہیں لی۔ آپ نے ایک دن مجھے اس کا شناختی کارڈ بتلاتے ہوئے کہا تھا...... دیکھو کتنی اچھی لڑکی ہے یہ اور کتنی خوبصورت۔ سوامی اس کو پسند کرنے لگا ہے...... یہی کہا تھا نہ آپ نے...... اب سوامی نے ہی اسے یہاں بھیجا ہے''۔ شانتی نے مجھے بتلایا...... میں شش و پنج میں باری باری دونوں کی صورت دیکھ رہا تھا کہ مجھے یاد آیا۔

'' اوہ! تو یہ سجاتا ہے اب یہ کتنی بدل گئی ہے۔ تھوڑی موٹی بھی ہوگئی ہے۔ پہلے کتنی دبلی تھی یہ۔''

'' تین بچے ہوگئے ہیں اس کے۔ موٹی نہ ہوگی تو کیا ہوگی''۔ پھر سجاتا کے جانے کے بعد شانتی نے

رازداری سے بتلایا'' یہ اب بھی ملتے ہیں۔ اس کا ایک بچہ تو پورا سوامی کی شکل کا ہے۔ گورا گمٹا موٹا تازہ''۔

''اچھا......'' میرے منہ سے تعجب سے نکلا...... ''کیا وہ آج بھی ملتے ہیں؟''

''ہاں ......'' شانتی نے ذرا غصہ سے کہا -- ''میں نے اس سے پوچھا تھا' تمہاری تو شادی ہو چکی ہے۔ پھر تم اس سے کیوں ملتی ہو...... معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا''۔

''کیا کہا تھا......!!'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''بولی تھی'' چاچی ...... ''بدمعاش کہیں کی۔ کل آپ آفس گئے ہوئے تھے۔ وہ یہاں آئی تھی''۔

''اب تم غصہ ہی کرتی رہو گی یا بتلاؤ گی کچھ''۔

''مجھے یہ سب کہنا اچھا نہیں لگتا...... ہندو لڑکی اور اتنی بے غیرت۔ انگریزی پڑھ لینے سے کوئی کرسٹین تو نہیں ہو جاتے۔ آخر میں بھی تو اسی کی ذات کی ہوں۔ تم نے میری شرافت دیکھ کر ہی تو کی ہو گی نہ مجھ سے شادی''۔

دراصل میرا اور شانتی کا کیس بھی ایسا ہی ہے۔ سوامی سجاتا ایک دوسرے سے شادی نہ کر سکے تھے لیکن ہم نے کر لی تھی' برادری والوں کے بائیکاٹ کے باوجود۔

میں نے دیکھا شانتی غصے سے کھول رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''آخر سجاتا نے کیا بتلایا تھا۔''

''کیا بتلایا تھا کہہ رہی تھی' شادی ہوئی تو کیا ہوا چاچی۔ میں تو سوامی کو دل ہی سے نکال چکی ہوں۔ لیکن ذہن سے نہیں نکال سکی۔ ہم دونوں کے ذہنوں میں بڑی ہم آہنگی ہے...... ہنہ آہنگی کی بچی ......'' وہ اسی طرح کھول رہی تھی۔ کہتی ہے ایک بار پھر اس تحریک کی ضرورت ہے ہم سے انصاف نہیں کیا جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں ہمارا ایک ایک بچہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ کیسی تحریک کیسا انصاف''۔

''تم سمجھ نہیں پاؤ گی شانتی''۔ میں نے محبت سے اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی...... ''تم ایک گھریلو عورت ہو انقلابی ذہن کی نہیں۔ تم کیا سمجھ پاؤ گی یہ سب۔ انقلابی ذہن والے ایک دوسرے کے دوست ہی بن کر رہ سکتے ہیں۔ اور اس طرح رہ کر ہی وہ کوئی کام کر سکتے ہیں۔ ورنہ رشتے کی بندھن ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے ہیں...... معلوم ہے ہمارا وطن آزاد نہ ہوا ہوتا اگر سبھی انقلابی ذہن والے ایک دوسرے سے شادی کے بندھن میں بندھ جاتے''۔

''بس ......بس رہنے دو'' وہ جھلا گئی...... ''مجھے معلوم ہے انقلابی ذہن ایک دوسرے سے نہ سہی کہیں نہ کہیں شادی کر ہی لیتے ہیں''۔

’’تمہارا مطلب سوامی کی شادی سے ہے نہ‘‘۔

’’ہاں...... ہاں! سجاتا تو شادی کر ہی چکی ہے۔ سوامی کیوں نہیں کر لیتا......شادی۔ مجھے معلوم ہے وہ کبھی شادی نہیں کرے گا‘‘۔

’’کیوں......؟ تمہیں کیسے معلوم‘‘ میں نے پوچھا۔

’’وہ جب بھی یہاں آیا ہے‘ میں نے اس سے یہی بات پوچھی ہے‘‘۔

’’پھر کیا کہا اس نے‘‘ میں نے پوچھا دلچسپی سے۔

’’آپ ہی دیکھئے کوئی اچھی لڑکی چاچی وہ کہتا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔ اس کے لئے کئی لڑکیاں ماں باپ دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکے ہیں۔ ہر بار جب بات چیت پوری ہو جاتی ہے اور شادی کی شبھ گھڑی نکالنے کا سمئے آتا ہے وہ ایک دم غائب ہو جاتا ہے شہر چھوڑ کر ہی چلا جاتا ہے۔ اور آتا ہے اُس وقت جب لڑکی والوں کو شرمندگی سے جواب دے دیا جاتا ہے‘‘۔

’’یہ بات مجھے پہلے کہاں معلوم تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا...... ’’اب کی بار وہ آئے تو اس سے کہنا‘ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ تو مجھ سے ملتا ہی نہیں۔ کئی برس ہو گئے ہیں اس کو دیکھے ہوئے‘‘۔

دوسرے دن......

رات کا وقت میں پلنگ پر بیٹھا سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ آیا اور آتے ہی میرے پیر چھو کر میرے بازو پلنگ پر بیٹھ گیا۔

ایک زمانہ بعد اسے دیکھ رہا تھا کنپٹیوں پر بالوں میں سیاہی کے ساتھ سپیدی بھی تھی۔ جسمانی طور پر وہ اتنا زیادہ پھیل گیا تھا کہ مجھ سے بھی زیادہ عمر کا لگ رہا تھا۔ کل تک وہ میرے سامنے بچہ تھا۔

’’تم تو میری عمر سے بھی زیادہ کے لگنے لگے ہو سوامی۔ آخر بات کیا ہے۔ اپنی شادی کی فکر ہے کیا تمہیں۔ بولو۔ میں تمہارے لئے اچھی لڑکی ڈھونڈ نکالوں گا...... سجاتا سے بھی اچھی‘‘......

وہ گھور کر میری طرف دیکھنے لگا......

’’نہیں تاؤجی!‘‘ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا...... ’’مجھے سجاتا کے بچوں کی فکر ہے‘‘۔

’’سجاتا کے بچوں کی۔ وہ کس لئے‘‘۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا......

’’ایسی فکر تو آپ کو بھی کرنی چاہیے تاؤجی۔ آپ کے بھی تو بچے ہیں نہ‘‘۔

’’میں کچھ سمجھ نہیں پایا سوامی‘‘۔

دراصل میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ پھر سجاتا نے بھی تو اس تحریک کا ذکر شانتی کے سامنے کر دیا تھا۔ یعنی

اس تحریک میں جس میں ہم سب کا مستقبل مضمر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارے علاقے کے لڑکے سیٹ نہ ملنے پر تعلیم کے میدان میں کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگر اتفاق سے تعلیم حاصل بھی کرلیں تو نوکریوں کے لئے کتنے سرگرداں۔

''آپ تو اخبار پڑھتے ہیں نہ تاؤجی۔ آپ کو کچھ نہیں معلوم'' وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا......

میں نے اسے اپنے گلے سے لگالیا۔ ''دراصل یہ مسئلہ سبھی کا ہے بیٹے۔ ایسے میں ہم نوجوان نسل کی پشت پناہی نہ کریں بلکہ یوں ہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو لگے گا ہم نے زندگی بنائی نہیں بلکہ گنوائی ہے۔

سوامی کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔ ایک بار پھر اس نے جھک کر میرے پیر چھوئے۔ میں بولا'' دیکھو سوامی! مجھ سے صاف صاف بتلاؤ مجھ سے چھپاؤ نہیں۔ سجاتا سے تمہارا کیا رشتہ ہے'' وہ چونک اُٹھا۔ پھر سر جھکائے دھیرے سے بولا'' کیا آپ کو بھی اس میں کچھ شک ہے''۔ ''شک تو مجھے نہیں۔ لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں''۔

دراصل سجاتا کی شادی' بدنامی کے خیال سے ایک ایسے مرد کے ساتھ کردی گئی تھی جو نشہ کا عادی تھا اور نشہ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ سجاتا سے اسے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

کل ہی میں نے اس بات کی تصدیق کرلی تھی۔ کیوں کہ میں کل ہی سوامی سے ہم شکل بچہ کی بات' شانتی کی زبانی سن کر چونک اٹھا تھا۔

سوامی خاموش بیٹھا رہا۔ اپنے منہ سے کچھ نہ بولا۔ میں اسے زیادہ پریشان نہ کرنے کے خیال سے بولا...... ''تم اپنے ماں باپ سے کھل کر بات کیوں نہیں کرلیتے''۔

''وہ اس بات کو سمجھ نہیں پائیں گے تاؤجی۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ کہیں سے ایک بچی لاکر میرے گلے میں باندھ دیں' چاہے وہ میرے گلے میں سجے نہیں''۔

پھر وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا اس کے جانے کے کچھ ہی لمحوں بعد شانتی میری بیوی اپنے سر پہ پلو پھیلاتے ہوئے میرے قریب پلنگ پر آکر بیٹھتے بیٹھتے بولی۔

''میں اس خیال سے یہاں نہیں آئی تھی کہ میرے موجودگی میں وہ صحیح صحیح بات آپ کو بتلائے گا نہیں......اس نے کیا بتلایا''۔

''اب آپ اسے شادی کے لئے پریشان نہ کریں''۔

''وہ تو میں پہلے ہی سمجھ بیٹھی ہوں۔ اس سے پیچھا چھوٹے تب نہ......لیکن یہ تحریک وحیریک کا کیا قصہ ہے''

”وہ تو اپنی جگہ قائم ہے۔ لیکن جو چیز ہو چکی ہو چکی۔ بعد میں ڈھول پیٹنے سے کچھ ہوتا ہے بھلا۔ اب ہماری مثال لے لو اگر میں مخالفت کے باوجود تم سے شادی نہ کر لیتا' تمہاری شادی ہونے کے بعد میرا پچھتانا! سانپ چلے جانے کے بعد لکیر پیٹنے کے برابر ہوتا نہ۔“

لیکن سوامی...... ”بس...... بس چپ رہو...... وہ ایک ناانصافی کے بعد دوسری ناانصافی سے لڑ رہا ہے۔ اسے لڑنے دو۔“

شانتی تن پھن کرتی پلنگ پر لیٹ گئی۔ پھر پلٹ کر سو گئی۔

میں نے جیب سے سگریٹ نکال لیا اور ماچس تلاش کرنے لگا کہ سجاتا میرے ذہن سے باہر نکل آئی وراس نے بڑھ کر مجھ پر ڈھیر سارا لال رنگ انڈیل دیا۔

دو مور

عشق یا محبت ایک ہی جذبہ کے دو الگ الگ نام ہیں۔ لیکن مطلب و مفہوم الگ الگ نہیں۔ کیونکہ جاں سوز کی حالت کو جاں سوز ہی سمجھے گا۔ یعنی شمع جس پر پروانے جاں نثار ہوتے ہی رہتے ہیں وہ خود جلتی رہتی ہے رات بھر سوزِ غم میں آنسو بہاتے ----یہی عشق ہے اور یہی محبت۔

عیدو اور صمد دو گہرے یار تھے جن میں دوستی کچھ ایسے ہی استوار تھی اور وہ ایک دوسرے پر کچھ اس طرح جان چھڑکتے تھے کہ عیدو بیمار ہو جاتا تو صمد بے چین ہو جاتا یا پھر صمد کو کچھ ہو جاتا تو عیدو کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تو خیال جاتا کہ اگر وہ ایک دوسرے سے الگ مخالف جنس کے ہوتے تو وہ بھی شاید لیلیٰ مجنون کی طرح ہوتے یا پھر شیریں فرہاد۔

صمد جو ذرا اچھا تن و توش کا مالک تھا اور میٹرک پاس ایک اچھا موٹر میکینک تھا اور عیدو جو دبلا پتلا ذرا کمزور جسم کا مالک تھا اور پڑھا لکھا بھی نہیں بے روزگار تھا۔ لیکن وہ اکثر صمد کے ساتھ ہی اس کے کارخانے میں آجایا کرتا تھا اور اسکے ہاتھ کے نیچے کام کرتا تھا یعنی صمد کو کبھی کوئی چیز کی ضرورت ہوتی کوئی پانوں کی' چمٹوں کی یا گریس گن کی وہ اس کو لاکر صمد کو دے دیتا اور پھر کارخانے کے کسی کونے میں لیٹا یا بیٹھا صمد کو کام کرتے ہوئے بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا......

دونوں نے ہی ابھی تک شادی نہیں کی تھی کیونکہ......صمد کا خیال تھا کہ اکثر لڑکیاں بے وفا ثابت ہوتی ہیں یعنی اگر وہ شادی کر بھی کرلیں تو ان کا ذہنی رشتہ اپنے پہلے یار میں ہی اٹکا رہتا ہے جن سے وہ شادی سے قبل کبھی پینگیں بڑھائی تھیں ---عیدو کا خیال اس سے مختلف تھا اس کا خیال تھا کہ کون ایسی جھنجھٹ میں پڑے اور ناحق جنجال مول لے جس طرح گذر رہی ہے بس وہی ٹھیک ہے---

عیدو کے تو خیر ماں باپ تھے ہی نہیں اس کے ماں باپ اس کے بچپنے میں ہی اُسے اکیلا چھوڑ کر دنیا سے سدھار گئے تھے......عیدو کی پرورش میں اُن لوگوں کا ہی ہاتھ زیادہ تھا جو سخی تھے اور عیدوں اور خوشیوں کے موقعوں پر وہ اسے کپڑے لیتے بنا دیا کرتے تھے اور اس کے بدلے عیدو ان کے گھر میں جب تک چھوٹا تھا کام کاج کر دیا کرتا تھا بازار سے سودا سلف لا دیا کرتا تھا اور مالکوں کے ہاتھ پیر بھی دبا دیا کرتا تھا جن کے بدلے

اُسے چار پیسوں کی آمدنی ہو جایا کرتی تھی جس کو وہ بڑی احتیاط سے خرچ کئے بناء جمع کرتا اور ہفتہ پندرہ دن بعد اُس رقم کو کسی زو کی نذر کر آتا محض جانوروں کو آزادانہ گھومتا پھرتا دیکھنے اصلی حالت میں اکھٹے ایک دوسرے سے ٹکراتے چرتے ہوئے ملتے ہوئے۔ صمد کو فرصت کہاں تھی' اس کا زو تو اس کا کارخانہ تھا جہاں ہمہ اقسام کی گاڑیاں آتی رہتیں دھلنے دھلانے درست ہونے۔ اس کے باپ کا انتقال تو اس کے بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔ اس کی اب صرف ماں ہی تھی اکیلی۔ جب کبھی وہ اپنے اکیلے پن سے گھبرا کر کبھی صمد کو بہولانے کیلئے کہتی تو صمد ہمیشہ ٹال جایا کرتا اور جب ماں ذرا زیادہ زور دیتی اور روتے ہوئے اپنے پلو سے آنسو پونچھتے کہتی ...... ''اب شائد تو میری آنکھیں بند ہونے کے بعد ہی بہولائے گا......'' تو صمد کا دل بھی پسیج جاتا وہ بتلاتا......

''ماں ! میں کیا کروں مجھے ابھی تک ایسی کوئی لڑکی ملی ہی نہیں کہ حقیقت میں ...... میں اس کے نزدیک پہلا مرد رہوں ...... ہر لڑکی کا تو کسی نہ کسی کے ساتھ کوئی چکر چلا رہتا ہے اب بھلا ...... تو ہی بتلا میں کیا کروں ...... اگر کہو تو لادوں ایسی لڑکی جو مجھ سے زیادہ کسی اور میں دلچسپی لے......''

ماں جھلا جاتی اور کہتی......

''اب بس کر زیادہ باتیں نہ بنا...... تیرے لئے شائد آسمان سے کوئی حور ہی اُترے گی......''

صمد کا اس بات کے لئے کوئی جواب ہی نہیں رہتا تو وہ بڑبڑاتا ہوا کارخانے چلا جاتا۔

کارخانے میں اس کا ذکر جب عیدوؔ کے سامنے کرتا تو عیدو کہتا......

''تمہیں اپنی ماں کی بات مان ہی لینی چاہے صمد...... تمہارا تو گھر ہے دار ہے اور اچھی خاصی آمدنی ہے...... میرا کیا ہے۔ میں تو اکیلا ہوں۔ نہ کوئی گھر ہے نہ دار۔ اکیلا ہی بھٹک رہا ہوں اور اکیلا ہی بھٹکتا رہوں گا۔ صمد جو ہاتھ میں پانا پکڑے انجن کی پیچوں کو کس رہا ہوتا کہتا......

''نہ...... ایسا نہ کہے عیدو ایسا نہ کہہ...... تو اپنا دل چھوٹا نہ کر جب تک میں زندہ ہوں۔ میں تیرے لئے ہی ہوں...... بلکہ سچ پوچھ تو میں شادی اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ کہیں جورو بچوں کے بیچ میرا دھیان تیری طرف سے ہٹ نہ جائے اور تیرا کوئی پوچھنے والا نہ رہے۔ نہ میں شادی نہیں کرونگا جب تک تو زندہ ہے میں زندہ ہوں ہم دونوں اسی طرح رہیں گے ایک دوسرے کے دوست بن کر کم از کم اس سے مجھے اس کا اطمینان تو رہے گا کہ میرا ایک دوست بھی ہے جو مجھ پر جان چھڑکتا ہے اور میں اُس پر جان چھڑکتا ہوں۔''

عیدو کی آنکھوں میں یہ سن کر آنسو آجاتے اس خیال سے کہ اس دنیا میں اس کا اور کوئی نہیں تو نہیں صمد تو ہے جو اس کا ایسا یار ہے جس پر اُسے بڑا فخر ہے۔

صمد کی طرح عیدو کے لئے ایسا کوئی خاندانی فرد تھا ہی نہیں جو اُس سے یہ کہتا کہ تو اب شادی کرلے اور اپنا ایک الگ سے گھر بسا بھلا...... اوروں کو اس کی کیا پڑی جو اس میں دلچسپی لیں اور اس سے کہیں کہ تو

شادی کر لے۔ انہیں تو اپنے کاروبار' نوکری چاکری بیوی' بچوں سے فرصت ہی نہیں رہتی۔

عیدو جب اکثر صمد کے ساتھ کارخانے میں نہیں ہوتا تو وہ ایک انگریزی کالج کی گیٹ کے سامنے سیکل کی پنکچر جڑانے والی دکان پر بیٹھا رہتا اور لڑکے لڑکیوں کو اچھے صاف ستھرے' قیمتی لباسوں میں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ اُن میں ایک لڑکی بھی تھی دبلی پتلی اونچی جو ہمیشہ کالے برقعے میں سرتاپاڈوبی رہتی اگر برقعے میں سے اسکے جسم کا کوئی حصہ دیکھلائی دیتا تو وہ نازک سفید ہاتھ پیر ہوتے اور نقاب میں سے جھانکتی دو بڑی بڑی کھلی سیاہ آنکھیں جو بہت کم جھپکتیں اور ان پر مور کے پروں پر بنی اُس شکل کا گماں ہوتا جو بالکل آنکھ کی طرح دکھلائی دیتی...... اُس سے ہمیشہ ایک لڑکا چمٹا رہتا جو دبلا پتلا اونچا تھا اور اس مجنون کی طرح لگتا تھا جو لیلیٰ کے فراق میں کبھی آہیں بھرا کرتا تھا۔ دونوں کا تعلق اونچے اور متول گھرانوں سے تھا۔

عیدو جب کبھی ان دونوں کو اکھٹے دیکھتا تو ایک ٹھنڈی آہ کھینچ کر رہ جاتا کہ کاش وہ بھی اُن میں سے رہتا لیکن ایسا کہاں ہوسکتا تھا۔

پنکچر کی دکان والا کاکا جب کبھی ان دونوں کو اپنی دکان کے سامنے سے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے اکھٹے گذرتے ہوئے دیکھتا تو وہ بڑی زور سے عیدو کی ران پر ہاتھ مار کر کہتا......

''کاش اپنے ساتھ بھی ایسا کوئی چکر چل رہا ہوتا تو بڑا مزا آجاتا یار لیکن اپن پڑھا لکھا کہاں'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتا۔

عیدو ہنس کر چپ رہ جاتا اور پھر کا کا ولکنائیزنگ کی تپتی ہوئی پلیٹ پر دبے ہوئے ٹیوب کو جو اس کی اس طرح کی لاپرواہی سے کچھ زیادہ ہی تاؤ کھا جاتا نکال کر ٹھنڈے پانی کی بکیٹ میں ڈوبا ڈالتا تو بکیٹ کا ٹھنڈا پانی کچھ دیر کے لئے نیم گرم ہو جاتا۔

یوں دیکھا جائے تو شائد عیدو ان دونوں کو اکھٹے آتے جاتے دیکھنے کے لئے ہی پنکچر کی دکان پر بیٹھا رہتا چونکہ جب وہ کالج کے اوقات ختم ہو جانے کے بعد اکھٹے چلے جاتے تو وہ بھی وہاں سے اُٹھ جاتا اور صمد کے کارخانے میں جاکر جہاں صمد بے حد معروف موٹر کے نیچے گھسا ہوا اس کا کوئی کل پرزہ ٹھیک کر رہا ہوتا تو وہ الگ چپ چاپ ایک کونے میں ٹانگیں پسار کر پڑ جاتا...... پھر ایسا ہوا کہ کچھ دنوں تک صمد کو وہ دونوں دیکھلائی نہ دیئے نہ اکٹھے ہی نہ الگ الگ تو اس کو ذرا تشویش ہوگئی اُس نے کاکا سے کہا:

''معلوم نہیں وہ دونوں کہاں چلے گئے''۔

''ہاں! کاکا نے بھی ذرا تشویش سے اپنے گال سہلاتے کہا...... ''معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہوئی ہے۔''

''گڑ بڑ۔۔۔! کیسی گڑ بڑ.....'' عیدو جھٹ بولا۔

''یہی کہ ان کے ماں باپ کو پتہ چل گیا ہوگا اور انہوں نے انہیں کالج جانے سے روک لیا ہوگا''

عیدو کو بڑی مایوسی ہوئی وہ دکان سے اسی طرح ہی اٹھ گیا جیسے اب وہاں سے اُس کی دلچسپی ختم ہوگئی ہے۔ اس واقعہ کا ذکر اُس نے صمد کے سامنے بھی کیا۔

صمد نے کہا......

''ایسی لئے تو میں شادی نہیں کرتا کہ کہیں کوئی لڑکی جو میری بیوی بنے گی وہ پہلے سے کسی چکر میں پھنسی ہوئی نہ ہو......''

عیدو نے خلاء میں گھورتے ہوئے جیسے خود سے کہا......

''مجھے یہ دونوں پسند آنے لگے تھے۔ ان کا اکھٹے چلنا پھرنا مجھے اچھا لگتا تھا......''

ایک دن عیدو یونہی کالج کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ پیچھے سے اس کے کانوں میں کاکا کی کراری آواز آئی جو سیٹی مار کر اُسے پکارتے ہوئے اپنے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا......

عیدو جب دکان پر پہنچ کر ایک خالی ڈبے پر جو کرسی کا بھی کام دیتا تھا اور سامان رکھنے کا بھی بیٹھ گیا تو کاکا نے ٹیوب کو وال کنائیزنگ کی گرم پلیٹ پر چڑھاتے ہوئے بولا۔

''تیرے لئے ایک خوشخبری ہے۔ معلوم ہے۔ وہ تیرے دونوں کہاں چلے گئے تھے''۔

''کہاں چلے گئے تھے'' عیدو نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''ہنی مون منانے!'' ہنی مون! وہ کیا ہوتا ہے۔

''تجھے اتنا بھی نہیں معلوم یہ بڑے لوگوں کے چونچلے ہوتے ہیں وہ شادی کے بعد ہنی مون منانے کہیں باہر اونچے مقام پر چلے جاتے ہیں اور پھر کسی جھاڑ کے نیچے پارک میں، جھیل کے کنارے وہی سب کچھ کرتے ہیں جو ہم تم بند کمروں میں کھاٹ پر کرتے ہیں''۔

''لیکن ان کی شادی کیسے ہوئی وہ تو ابھی پڑھ رہے تھے......

''انہوں نے ماں باپ کی مرضی لئے بناء خود سے شادی کرلی۔ سیول میرج''

''سیول میرج'' عیدو مزید پریشان ہوگیا...... معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو شادی کو کیا سیول میرج بھی کہتے ہیں۔

''ہاں!...... لیکن یہ ایسی شادی ہوتی ہے جس میں نوجوان لڑکا لڑکی اپنی پسند اور مرضی سے کورٹ میں جا کر شادی کرلیتے ہیں...... پھر وہ ڈال کنائیزنگ پلیٹ کے نیچے رکھے ہوئے بتیوں والے چولہے کی لو کو

بڑھاتے ہوئے بولا...... ''بھلا ہوا ان انگریزوں کا کہ انہوں نے جاتے جاتے یہاں ایسے کورٹ قائم کردیئے جس میں لڑکا اور لڑکی اپنی من مانی کرسکیں اور ان کے ماں باپ صرف ہاتھ ملتے رہ جائیں''۔

عیدو کو پہلی بار ایسے کورٹ کا پتہ چلا تھا تو اس کے چہرے پر شرم کی ایک سُرخی سے دوڑ گئی اور وہ دل ہی دل میں انگریزوں کو دعائیں دینے لگا کہ بھلے سے وہ ہندوستانیوں کے لئے اور کچھ نہ کئیے ہوں لیکن جاتے جاتے انہوں نے ایسے کورٹ تو قائم کردیئے جس میں دو چاہنے والے دل ایک دوسرے سے مل سکیں اور جس میں دولت اور زور زبر کی گنجائش نہیں۔

دوسرے دن کارخانہ میں عیدو کا خوش وخرم چہرہ دیکھ کر ہی صمد اپنا کام چھوڑ کر اس کے پاس چلا آیا اور اس کے قریب بیٹھتا ہوا اس کی پیٹھ پر دھپا مار کر بولا:

''معلوم ہوتا ہے آج ہمارے یار کو کچھ ایسی خوشخبری ہاتھ لگی ہے جو اسے بہت زیادہ پسند ہے۔ کیا ہوا ان دونوں کا کیا ان کا کچھ پتہ چلا:

''ہاں! انہوں نے ماں باپ کی مرضی لئے بغیر ہی ایک دوسرے سے شادی کرلی: عیدو نے خوشی سے لرزتے کہا: ''سیول میرج''

پھر عیدو نے صمد کو وہ تمام باتیں بتلادیں جو کاکا نے اسے بتلائیں تھیں اور اُس نے ان دونوں کا حلیہ بھی صمد کو بتلادیا......

صمد یکلخت سوچ میں پڑ گیا۔ پھر جیسے وہ خود سے مخاطب ہوا۔ ''کل میں ان دونوں کو دیکھوں گا۔ میں اکیلا ہی وہاں جاؤنگا اور گیٹ سے دور ہٹ کر ان کو دیکھوں گا......

عیدو جو غور سے صمد کی طرف دیکھ رہا تھ بولا......

''لیکن تم ان کو پہچان کیسے پاؤ گے کہ وہ وہی ہیں''۔

میں انہیں پہچان لونگا...... ہزاروں میں بھی...... تم نے مجھے ان کا حلیہ بتلا دیا ہے۔ وہ کافی ہے۔

''صمد نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا......

دوسرے دن صمد کالج کی گیٹ سے دور ہٹ کر پنکچر کی دکان کے مخالف سمت میں کھڑا لڑکے لڑکیوں کو گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو مختلف رنگوں کے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھے......

اکثر لڑکیاں شرٹ شلوار پہنی ہوئی تھیں، بعض اسکرٹ میں بھی تھیں کچھ لڑکیوں کے اسکرٹ اتنے اونچے تھے کہ جب بھی وہ ہوا کے زور سے اوپر اُٹھ جاتے تو لگتا وہاں بجلیاں کوندرہی ہیں۔ ایسی چکا چوند سے نظریں ہٹائے صمد کو تو کسی اور نظارے کی تلاش تھی جلد ہی اسے وہ نظارہ مل گیا۔ وہ جیسے ٹھٹھک گیا!

وہ دو برقعے میں سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایسی ہی تھیں جو بہت کم جھپک رہی تھیں بلکہ وہ یوں ساکت تھیں جیسے کوئی مور دم پھیلائے کھڑا ہے...... اگرچہ اس کا سارا جسم برقعے میں چھپا ہوا تھا لیکن اس کے دو نازک سفید ہاتھ برقعے سے باہر تھے جن میں سے ایک ہاتھ اُس دبلے پتلے لڑکے کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا جس کے بال لانبے لانبے مور کی دم کی طرح خوبصورت تھے۔

صمد انہیں اس طرح ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا جیسے وہ آدم وحوا کے بیٹے بیٹی نہیں بلکہ کوئی ایسی آسمانی مخلوق ہیں جو سیدھی آسمان سے زمین پر اُتر آئی ہیں..... حور اور ملائیک کا ذکر اُس نے مذہبی کتابوں میں پڑھا تھا لیکن انہیں دیکھتے ہوئے اُسے ایسے ہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ حور و ملائیک تو نہیں زمینی مخلوق ہیں عجیب و غریب جب وہ دونوں اس کے سامنے سے ہوتے ہوئے دور ہونے لگے تو صمد نے پلٹ کر بھی انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا حتی کہ وہ دور ہوتے ہوتے ہوے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے --- تب صمد نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور چاند کی ڈھالیہ ہوٹل میں ٹیبل کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور کافی کا آرڈر دے کر خلاء میں گھورنے لگا......

عیدو بھی جو پنکچر کی دکان پر بیٹھا صمد پر نظر رکھے ہوئے تھا اس کے پیچھے ہی ہوٹل میں گھسا اور صمد کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا......

صمد نے چونک کر ایک نظر عیدو پر ڈالی اور کچھ کہے بغیر اپنا سخت اور کھردرا ہاتھ آگے بڑھایا اور عیدو کے نرم و نازک ہاتھ پر رکھ دیا......

اس سے عیدو کے جسم میں ایک ہلکی سے کپکپاہٹ ہوئی اور اس کی دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھلی ہوئی ایسے ہی ساکت ہو گئیں جیسے کوئی مور دم کھول کر پھیلا دیتا ہے۔

کاکا وال کنائیزنگ کی تپتی ہوئی پلیٹ پر پنکچر زدہ ٹیوب کو چڑھا رہا تھا تو یہ دکھ کر دنگ رہ گیا کہ چاند کی ڈھالیہ ہوٹل سے نکلتے ہوئے عیدو کا ہاتھ صمد کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور دونوں کی ہی آنکھیں کسی مور کے پنکھ کی طرح ساکت و جامد تھیں۔ وہ بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے برقعے و پینٹ میں ملبوس اُن آنکھوں اور ان آنکھوں میں کیا فرق ہے۔

کاکا پڑھا لکھا ہوتا تو سمجھ جاتا کہ دو مخالف جنسوں کی دوستی یا تو ازدواجی بندھنوں میں باندھ دیتی ہے یا پھر بندھنوں سے آزاد کشش ثقل کی طرح قریب ہوں تو ملا دیتی ہے دور ہوں تو جدا کر دیتی ہے سر آئیزک نیوٹن کی یہی دریافت ہے Opposite poles are attract اور Same poles کشش سے آزاد بناء بندھن کے ہم جنس کا طرہ امتیاز اس سمت یہی ہے جو دوستی کی ایک الگ پہچان ہے بناء کسی بندھن کے دو مور جیسے۔

گہرائی

گہرائی دل میں بھی ہوتی ہے' دماغ میں بھی احساسات میں بھی' لیکن ڈر میں گہرائی بہت عمیق ہوتی ہے جو کسی کنویں کی گہرائی سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے......

برہنہ شاہ کی درگاہ کے وسیع احاطے میں گول گنبد کے پچھواڑے ایک قدیم کنواں ہے اس کی شکستہ مینڈھ کی اونچائی پر چڑھ کر آج بھی وہاں سے ننگ دھڑنگ مرد اور برہنہ بچے بے خوف پانی میں چھلانگیں لگاتے رہتے ہیں اور کنویں میں بل کھا کر اُوپر سے اُترتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں جو پانی میں غائب ہو کر نہ جانے کہاں جا پہنچتی ہیں ان پر عورتیں اور بچیاں پانی بھرنے اور کپڑے دھونے میں مصروف دکھائی دیتی ہیں تو آج بھی مجھے برسوں بعد بانو بچپن سے لے کر جوانی میں قدم رکھتے ہوئے ان ہی مختلف لڑکیوں اور عورتوں میں دکھائی دینے لگتی ہے......یعنی جب بھی میں چھوٹی سی لڑکی کو تجسس سے حیرت زدہ ان چھلانگوں پر آنکھیں پھاڑے دیکھتا ہوں تو لگتا ہے یہ بانو کا بچپن ہے اور ذرا بڑی جوان لڑکی کو دیکھتا ہوں جو نظریں نیچی کیئے آنکھوں کے جھروکوں سے ان نظاروں کو دیکھتی ہوئی لڑکھڑاتے قدموں سے گزر رہی ہوتی ہے تو لگتا ہے یہ بانو کی جوانی ہے اور جب بانو کے گھر کی چار دیواری پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے آج بھی وہاں دروازے پر پڑی ہوئی جھری تو نظر آتی ہے لیکن شادی کے بعد سے اب وہاں بانو دکھائی نہیں دینے لگی ہے تو یہ جھری مجھے بڑی سونی لگتی ہے اور وہ بڑ کا درخت بھی جہاں رجو پہلے اپنے چیلے چانٹوں کے ساتھ بیٹھا اُس جھری کو تکتا ہوا اپنی نوکیلی موچھوں کو اور نوکیلی بناتا ملن کے گیت گایا کرتا تھا۔ آج اُس کی یہ چال بھی سونی ہے' اب وہاں رجو کے چیلے چانٹے بیٹھے ہوئے تو رہتے ہیں۔ لیکن چپ چاپ اب وہاں پہلے جیسی گرم جوشی تو نہیں رہی جو رجو کے دم سے تھی۔

اب میں آپ کو کچھ رجو کے تعلق سے بھی بتلا دوں کہ رجو' شیخ فجو رمضانی کا لڑکا بڑا ہی جیالا اور بچپن میں اُتنا ہی نٹ کھٹ تھا---اس کا بچپن اور بانو کا بچپن بڑا ایک ساتھ گزرا تھا اتنا ساتھ کے بعد اوقات رجو ننگ دھڑنگ مینڈھ کی اونچائی پر سے چھلانگ لگا رہا ہوتا تو بانو نیچے کھڑی دہشت سے آنکھیں پھاڑے چیخ ماردیتی---لیکن جوانی میں وہ ساتھ نہیں رہے چونکہ گاؤں کے رواج کے مطابق لڑکی پر جب سیانے

پن کا دورہ پڑتا ہے تو اس پر روک ٹوک لگادی جاتی ہے' اور جب بانو پر روک ٹوک لگادی گئی تو رجو کی دلچسپی جو بانو کے دم سے تھی اس میں کمی ہونے لگی تو پھر رجو نے اس کمی کو بانو کے گھر کے سامنے بڑ کے جھاڑ کے نیچے بیٹھک بنا کر پوری کر لی تھی۔

پھر آگے یوں ہونے لگا کہ رجو بڑ کے جھاڑ کے نیچے بیٹھا درد بھری آواز میں ملن اور برہا کے گیت گا رہا ہوتا تو بھولی بھالی بانو جھری کے پیچھے سہمے سہمے انداز میں ان بولوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوتی۔

بانو پڑھی لکھی تو نہیں تھی اور اتنی ناسمجھ بھی نہیں تھی لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی تھی ان گانوں کے بولوں سے کہ اُس کی زندگی میں بھی ایک ایسا ہی بانکا آنے والا ہے جو اسے ماں باپ سے گھر دار سے سہیلیوں سے حتی کہ گاؤں تک سے بچھڑا کر لے جائے گا کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں جائیں گے وہ اکیلی ہی جائے گی اور اس کا وہ بانکا جس کی موچھیں بڑی تیز ہوں گی نشتر کی طرح' جس کا جوڑ چکلا سینہ ہوگا۔ آپریشن ٹیبل کی طرح وسیع جس پر وہ سوچتی وہ اکیلی چت پڑی ہوگی اور اُوپر صرف ایک بالشت کے فاصلے پر وہ بانکا ہوگا۔ اس کی وہ نشتر کی طرح تیز نوکیلی اٹھی ہوئی مونچھیں ہوں گی جو دھم سے اس پر گریں گی۔

ان گیتوں اور ایسی مونچھوں سے بانو کے دل پر کچھ اس قسم سے ایسی ہی وحشت طاری ہو جاتی تھی کہ لگتا شاید وہ گانوں کے مفہوم کو زیادہ سمجھ نہ پائی ہے لیکن جو بھی سمجھ پائی تھی وہ بس اتنا ہی تھا اور وہ آگے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھی کیونکہ جہاں کہیں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سہیلیوں کے درمیان چھڑ جاتیں تو وہ وہاں سے دُم دبا کر بھاگ جاتی۔

سونے پہ سہاگہ یہ ہوتا کہ جب بھی محلے میں شادی بیاہ کی برات ہو جاتی تو وہ ہوتی اور وہ کھڑکی جس میں بیٹھی ہوئی وہ اُداس اداس نظروں سے دیکھتی رہتی تو اسے ڈولی میں سوار ہوتی روتی دھوتی دُلہن ایسی لگتیں جیسے بکری کو زبردستی اُس کے مرضی کے خلاف ذبحہ خانہ لے جایا جا رہا ہے اور شادی میں بجتا ہوا بینڈ ڈھم ڈھم ایسے لگتا جیسے مردے کے سامنے بج رہا ہے اور پیچھے مردہ چاروں خانے چت چار آدمیوں کے کاندھوں پر چلا آرہا ہے۔

پھر جس طرح موت کا یقین تھا۔ اس طرح اُسے شادی کا بھی یقین تھا۔ بس یہی بات اُس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی کی طرح بجتی رہتی تھی اور یہ گیت رجو کے اور اس کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اس کے ننھے سے دل پر اتنی کاری ضرب لگاتے کہ وہ جھری میں آنکھیں گاڑے رجو کو نہیں بلکہ قبرستان کو دیکھ رہی ہوتی جہاں آج نہیں تو کل ہر ایک کو جانا ہے۔

ادھر رجو کے گیت الگ رنگ لانے لگے تھے وہ جو بڑ کے جھاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا جھری کو تکتا جس کے

پیچھے بانو ایک کبوتر کی طرح کانپ رہی ہوتی برہا کے گیت الاپتا رہتا تھا گاؤں والوں نے سوچا اس سے بہتر بانو کے لئے کوئی اور بر نہیں---شادی چاہت کا ایک بندھن ہی تو ہوتی ہے چنانچہ ایسی بندھن میں بانو کو باندھ دیا گیا---بانو منہ سے کچھ کہہ نہ سکی---بھلا گاؤں والوں کو اس کا کیا علم تھا کہ عروسی کی شب بانو کی یہ خاموشی کچھ نہ کچھ رنگ لائیگی ضرور۔ گاؤں کی فضاء شب عروسی کے لئے ویسے بھی سیاہ ہوتی ہے اور پھر آج بانو کی شب عروسی میں جانے کیوں بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی لگتا تھا جیسے ساری آوازیں بارش کی نذر ہو گئی ہیں۔

عین اسی وقت جبکہ بارش اور زور پکڑ گئی تھی۔ رجو اچانک عروسی کے کمرے سے لڑکھراتا ہوا باہر نکلا اس کا چہرہ پسینے سے تربتر تھا' باہر لوگ آڑے ترچھے پڑے ہوئے جیسے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے---وہ بیحد گھبرایا ہوا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا تیز بارش میں بھیگتا ایک لابنا فاصلہ طئے کرتا چال میں گھس آیا۔

چال میں صرف ہلکا سا ایک دیا ٹمٹا رہا تھا جس کی مدھم روشنی میں رجو کو دیکھ کر داؤدے گھبراہٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اتنی رات گئے وہ بھی شادی کی رات رجو کی موجودگی یہاں اکیلے میں اُسے بے چین کر دیا---کیا بات ہے رجو! پریشان لگ رہے ہو---؟"اس نے گھبراہٹ سے پوچھا۔

"میں مجرم ہوں داؤدے' میں مجرم ہوں"

داودے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ غور سے رجو کو دیکھنے لگا---رجو کا چہرہ وحشت سے سیاہ پڑ چکا تھا۔

وہ خوف سے چلایا---"میں مجرم ہوں میں نے بانو کا خون کر دیا ہے!"

اچانک ایک روز سے بجلی کڑکڑائی داؤدے کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی---"لیکن کیسے---"اس کے حلق سے ایک دبی سی آواز نکلی اور وہ دیوار سے لگ گیا۔ رجو جیسے خواب میں بول رہا تھا۔

"بانو کی سہیلیوں نے اس کے ازار بند میں آٹھ دس گانٹھیں بڑی مضبوط سے ڈال دیں تھیں میں اُسے کھول نہ سکا تھا تو چاقو سے کاٹنے لگا---عین اسی وقت بانو نہ جانے کسی خوف سے میری بانہوں سے نکلی اور چاقو کا پھل اس کے پیٹ میں اُتر گیا"۔

داودے وحشت سے پیچھے ہٹا' عین اس وقت رجو کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ دیوانے کی طرح بھاگتا ہوا۔ باہر نکل گیا اور ایسا نکلا کہ پھر کبھی گھر نہ لوٹا۔

آج بھی رجو اس صدمے سے پاگل ہے اور اپنے حواس کھو چکا ہے اور الف ننگا بازاروں میں پھرتا رہتا جب کبھی شادی کی برات دیکھتا ہے تو اس پر مزید دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے۔ وہ وہاں سے چیختا ہوا بھاگ

کھڑا ہوتا ہے۔

اس طرح اس واقعے کے بعد سے رجو کی وہ چال ابھی تک سونی سونی ہے اور بانو کے گھر کی چار دیواری کی وہ جھری بھی۔

میرا گزر جب کبھی برہنے شاہ کی درگاہ کے وسیع احاطے کے پچھواڑے قدیم کنویں کی طرف سے ہوتا ہے تو مجھے بانواب بھی ان ہی لڑکیوں اور عورتوں میں دکھائی دینے لگتی تو جانے کیوں میرے دل میں ایک ہول سی ہونے لگتی ہے۔

اس وقت میں داودے' رجو کی چال میں آ کر رونے لگتا ہوں تو رجو دور کھڑا مادرزاد برہنہ شکستہ منڈھیر کی اونچائی پر چڑھ کر نیچے کنوئیں کی تہہ میں جھانکنے لگتا ہے تو کوئی کمسن لڑکی آنکھیں بند کئے دہشت سے چیخ مار دیتی ہے' اس کے ساتھ ہی ایک زور کی آواز سے کنوئیں کا پانی اچھل پڑتا ہے--- میں داؤدے جلدی سے رجو کو پانی میں سے نکال کر لاتا ہوں' اور اسے چال میں لا کر کپڑے پہنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تو وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

چندہ

چندہ ہمیشہ نیک کام کے لئے ہی لیا جاتا ہے۔ بناء رسید کے بھی اور رسید کے بھی۔
کسی نہ کسی مد پر یا بنیاد پر......

اتوار کا دن تھا۔ صبح صبح کا وقت، میں ابھی بستر میں سردی کے مارے ٹھٹھرا دبکا پڑا تھا کہ دیوار پر لگی برقی گھنٹی جھنجھنا اُٹھی...... میں نے رضائی سے سر باہر نکالا۔ دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی، نو بجے تھے۔۔۔ معلوم نہیں، اس وقت کون آمرا ہے۔ میں جھنجھلا اُٹھا۔ ''دیکھو صفیہ! باہر کون ہے؟'' میں نے اپنی بیٹی کو بستر پر سے ہی آواز دی۔ ''بابا۔ ذرا آپ ہی اُٹھ جایئے۔ رضی رو رہا ہے۔ اور امی باورچی خانہ میں ناشتہ بنا رہی ہیں۔

میں لامحالہ اُٹھ بیٹھا اور بچوں پر طیش کھانے لگا، جنہیں اتوار کے دن بھی گھر میں رہنے کی عادت نہیں۔ آج ٹیوشن بھی نہیں جانا ہے۔ پھر معلوم نہیں وہ کہاں چلے گئے ہوں گے اب گھر میں چونکہ میں اکیلا ہی پڑا رہ گیا تھا اس لئے چاروناچار اُٹھا۔ اور کھڑکی کھول کر میں نے نیچے جھانکا...... چونکہ ہم اوپری منزل پر رہتے ہیں۔

نیچے ایک نہایت ہی شریف بڑے میاں کھڑے دکھائی دیئے، نورانی چہرہ، سفید گیر داڑھی جو گالوں، تھوڑی اور اُس کے نیچے بھی بے تحاشہ پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں قلم دبا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک رسید بک جو سفید تھی، شاید چندے کی۔ اور آنکھوں پر دائرے کی شکل کا گول گول موٹے شیشوں والا چشمہ چڑھا تھا وہ رسید بک کو چشمے کے بے حد قریب لا کر اُس پر کچھ لکھ رہے تھے۔ بہت آہستہ آہستہ تھرتھراتے ہاتھوں سے اور میں قبل اس کے کہ انہیں اپنی طرف پکار کر متوجہ کر لیتا۔ ہٹ کر صفیہ کی طرف دیکھا۔ جو اپنے بچے کے کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ میں کھنکھار کر بولا ''دیکھو نیچے کوئی بڑے میاں ہیں۔ شاید چندہ مانگنے آئے ہیں مسجد کا۔۔؟''

پیسوں کی کوئی بات ہوتی تو صفیہ مجھے زہرہ کی طرف ڈائریکٹ کر دیتی جو کہ میری بیوی ہے اور گھر

کے سارے اخراجات اُس کے ہاتھ میں رہتے ہیں اور میں بھی اپنی ساری تنخواہ لاکر زہرہ کے ہاتھ میں ہی دے دیتا ہوں۔ جس طرح کوئی اپنی بچت بینک کے کھاتے میں بڑے اطمینان کے ساتھ جمع کرادیا ہے' اس خیال سے کہ پیسے یہاں محفوظ رہیں گے۔ اور مجھے تو اس کا پورا پورا اطمینان رہتا کہ زہرہ بھی میرے لئے ایک محفوظ بینک ہے' بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ کہ بینک میں تو چوری اور لوٹے جانے کا ڈر لگا رہتا ہے اور سب سے بڑا خوف اس بات کا کہ نہ جانے کب سرکار کی طرف سے بینکوں میں انکم ٹیکس والوں کا دھاوا پڑ جائے--؟ لیکن مجھے تو ایسا کوئی ڈر نہیں تھا۔ یوں بھی میری تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ انکم ٹیکس والوں کے معیار پر پوری اُتر سکے۔ اور نہ ہی بینک میں میرے نام کوئی کھاتہ تھا۔

لیکن اس بار صفیہ بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح مجھے پیسوں کے لئے زہرہ کی طرف ڈائریکٹ کردیتی بچے کو بٹھا کر وہ خود اُٹھی اور الماری کھول کر اپنے پرس میں سے پانچ روپئے کا ایک نوٹ نکال لائی اور نوٹ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے آہستہ سے بولی:

''چپ چاپ یہ چندہ آپ انہیں دے آیئے۔ لیکن امی کو اس بارے میں کچھ نہ بتایئے۔!''

میں حیران رہ گیا کہ آخر کیوں ......؟ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ بڑے میاں ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں آتے ہیں اور چندہ لے کر جاتے ہیں۔ زہرہ کو ان کا آنا اس لئے پسند نہیں کہ وہ ہر گھر سے اس مسجد کے لئے چندہ لے جاتے ہیں جو ہمارے محلے میں نہیں' بلکہ کسی دور دراز کے محلے میں واقع ہے۔ زہرہ کا کہنا ہے کہ اُس محلے میں مسجد کے لئے چندہ دینے والا کوئی نہیں ہے کیا جو یہ یہاں اتنی دور سے آکر لے جاتے ہیں۔ یہاں قریب کی مسجد کا چندہ ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ پھر اس کا بھی کیا یقین کہ وہ جمع کی ہوئی رقم مسجد میں' مسجد کمیٹی والوں کو دے بھی آتے ہیں یا نہیں؟

کبھی ایسا بھی ہوا کہ بڑے میاں آئے اور زہرہ کا اُن سے سامنا ہو گیا تو بڑے میاں کو پہلے اُن کے غصے کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر چندہ کافی جھلاہٹ کے بعد ملا۔

اس کے باوجود بڑے میاں ہر ماہ بڑی پابندی سے آتے اور چندہ وصول کرکے لے جاتے۔ زہرہ کو اس کا پتہ کبھی کبھار ہی لگتا چونکہ صفیہ چپ چاپ نیچے اُتر کر اپنی طرف سے انہیں یہ چندہ دے آتی۔ ایسا کب تک ہوتا رہا؟ اس تعلق سے نہ کبھی میں نے صفیہ سے پوچھا اور نہ ہی کبھی صفیہ نے اس تعلق سے مجھے کچھ بتلایا۔ معلوم نہیں زہرہ کو اس کی خبر تھی بھی یا نہیں۔

آخر جب صفیہ کے شوہر جو باہر ملازمت کے سلسلے میں چھٹی پر لوٹے تو صفیہ اپنی سسرال چلی گئی......

جس سے گھر کے سارے کام کاج کا بوجھ زہرہ کے کندھوں پر آپڑا۔ گھر میں کوئی ملازمہ بھی نہیں تھی جو وہ اُن کا ہاتھ بٹاتی بچے صبح صبح ٹیوشن پڑھنے چلے جاتے۔ لے دے کر ایک میں ہی اکیلا رہ گیا تھا اور مجھے بھی صبح صبح اپنی ڈیوٹی پر جانا ہوتا تھا۔

اس لئے زہرہ صبح کے ان اوقات میں کافی جھلائی ہوئی رہتی تھی۔

صرف ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چونکہ سرکاری ملازمین کی تعطیل ہوتی ہے اس لئے اُس دن میں ذرا جلدی ہی بستر چھوڑ دیا کرتا ہوں' اس خیال سے کہ کام میں زہرہ کا کچھ ہاتھ بٹا سکوں اور میں اُس دن...... سارے کام نمٹا دیا کرتا تھا۔ جو بقول نوکروں کے جھاڑ پونچھ' برتنوں درتنوں کی صفائی اور کپڑے لتے دھونے کے تعلق سے ہوتے۔

چونکہ آج بھی دوسرا ہفتہ ہونے کے سبب تعطیل تھی۔ لیکن اس بار میں حسبِ عادت جلد ہی بستر نہیں چھوڑ سکا...... میرے اعضاء کچھ مضمحل تھے۔' دوسرے میرے جسم میں کچھ بخار کی ہلکی سی حرارت بھی تھی۔ اس لئے کہ رات دیر گئے تک دوستوں کے ساتھ تاش کی بازیاں کھیل کر لوٹا تھا۔ ابھی میں اُٹھ کر بستر میں ہی بیٹھا تھا کہ دیوار پر برقی گھنٹی بول پڑی تو میرا خیال فوراً بڑے میاں کی طرف چلا گیا۔ جو مسجد کا چندہ وصول کرنے ہر ماہ بڑی پابندی سے آتے ہیں یہ خیال اس وجہ سے بھی آیا تھا کہ اس مہینے کی یہ ابتدائی تاریخیں تھیں۔ چنانچہ میں فوراً بستر چھوڑ کر اُٹھ بیٹھا۔ اور چاہتا تھا کہ صفیہ کو آواز دوں۔ لیکن خیال آیا کہ وہ ان دنوں اپنی سسرال میں ہے۔ اور بچے بھی گھر پر نہیں ٹیوشن پڑھنے گئے ہوں گے...... پھر یہ سوچ کر کہ آگے نیچے وہ بڑے میاں ہی ہیں اور ایسے میں زہرہ کا سامنا اُن سے ہو جائے تو ناحق کی بک بک جھک جھک ہوگی۔ اس لئے میں فوراً کمرے سے باہر نکل آیا۔ لیکن تب تک زہرہ باروچی خانے سے نکل کر کھڑکی کھولتے ہوئے نیچے جھانک چکی تھی۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹی تو اُس کے چہرے پر جھلاہٹ کا نام ونشان تک نہ تھا۔ بلکہ وہاں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اس ہمدردی کے تحت جھٹ اپنی چھوٹی سی پاکٹ جو ہمیشہ ان کے بلاوز میں اڑسی رہتی تھی کھول کر اس میں سے انہوں نے دس روپئے کا ایک نوٹ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔

''نیچے وہی بڑے میاں آئے ہیں ذرا انہیں یہ دے آیئے......!''

میں نوٹ لیتے ہوئے حیران رہ گیا...... کہ یکدم دس' روپئے کا نوٹ......؟ اور حیران نگاہوں سے' کچھ دیر تک اس کی جانب دیکھتا رہا۔

میرے اس طرح گھور گھور کر دیکھتے رہنے پر وہ ایک دم جھنجھلا اُٹھی۔

''اوہ ---آخر کیا منہ دیکھ رہے ہیں آپ میرا۔ جائیے اور نیچے جا کر دے آئیے یہ چندہ نیچے آخر بڑے میاں کب تک کھڑے رہیں گے؟''

میں نیچے گیا اور اُن بڑے میاں کو خاموشی سے چندہ دے آیا۔

نیچے وہی بڑے میاں تھے۔ نورانی سا چہرہ گیر دوار ڈھی' ہاتھ میں تھر تھراتا ہوا قلم...... اُسی تھر تھراتے قلم سے انہوں نے رسید بک کو اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک کو بہت قریب لاکر کچھ لکھا اور رسید چاک کی' رسید پر کیا لکھا تھا یہ میں نے نہیں دیکھا بلکہ دس کا نوٹ اُن کے حوالے کر کے' رسید لیکر سیدھا اوپر آگیا۔

میں تو زہرہ کی اس بدلی فطرت پر حیران تھا کہ یہ انقلاب کیسے بپا ہوگیا۔ کیسے ہوگیا یہ تغیر۔ راتوں رات حکومتوں کو بدلتے سنا تھا اور دیکھا بھی تھا۔ لیکن فطرت کا یہ انقلاب میری سمجھ سے بالاتر تھا چنانچہ میں رسید لے کر زہرہ کے پاس پہونچا۔

باورچی خانے میں وہ پیاز کاٹ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

میں نے کہا -- ''کیوں رو رہی ہو' آخر۔ کیا اس لئے کہ چندہ دور دراز کی مسجد کو چلا گیا۔ اگر نہیں بھی گیا تو ناحق دس روپئے کا نقصان ہوگا۔ اس لئے کہ وہ بڈھا...... دس روپئے ہضم کر جائے گا''۔ اگر چہ یہ زہرہ کے ہی الفاظ تھے' اُسی کے خیالات تھے' جو میں نے برملا کہہ دیئے تھے میرا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود زہرہ تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ''کیا......؟''

''کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔'' میں اس کے تیور دیکھ کر ایک دم گڑ بڑا گیا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جو کچھ تم نے کیا وہ ثواب کا کام تھا۔

''بہت بڑے ثواب کا کام''۔ وہ یہ کہتی ہوئی پیاز کو گیس کو چولہے پر چڑھاتے ہوئی بولی۔

میں اور زیادہ حیران رہ گیا۔

پھر وہ بولی۔

''ایک دن گھر پر کوئی بھی نہیں تھا'' وہ پکاتے پکاتے یکدم سوچ میں ڈوب گئی...... آپ بھی نہیں' صفیہ بھی نہیں بچے بھی نہیں۔ گھنٹی بجی اور میں یہ دیکھ کر نیچے وہی بڑے میاں ہیں۔ وندناتے وہاں پہنچی۔ اس خیال سے کہ ان کی اچھی طرح سے خبر لوں گی۔ لیکن وہ بڑے میاں تو میرے بگڑے تیور دیکھ کر ہی یکدم پسیج گئے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں ہی انہیں دیکھ کر پسیج گئی تھی۔ کیوں کہ اُن کے موٹے موٹے عینک کے شیشوں میں سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز دکھائی دے رہی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے اور میں کیا سن رہی تھی۔...... چونکہ میرے حواس شل ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت جان کر کہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا

جوان' جو طویل بیماری میں فوت ہو گیا اور اب ایک بیٹی ہے ان کی جو جوان ہے اور شادی کے قابل گھر میں کمانے والا کوئی نہیں اور انہیں ہمیشہ اپنی اس اکلوتی بیٹی کی شادی کی فکر لگی رہتی ہے۔ اُس وقت تو میں انہیں سو روپئے کا ایک نوٹ دے کر آئی تھی اور ان سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ ہر مہینے آ کر میرے یہاں سے دس روپئے لے جایا کریں۔ پانچ مسجد کے چندے کیا اور باقی پانچ خود کے......!''

تبھی میرے منہ سے یکدم نکل جاتا کہ معلوم نہیں وہ بڈھا جو مسجد کے نام پر چندہ جمع کرتا ہے وہ بھی مسجد میں' مسجد کمیٹی کو دے ہی آتا ہے یا نہیں کہ زہرہ نے چونک کر چولہے پر رکھے بگھونے کو تھالی سے ڈھک دیا اور بولی:

''اللہ کے گھر کی دیکھ بھال کرنیوالے تو بہت امیر و کبیر پیسے والے ملتے رہتے ہیں۔ لیکن اُن گھروں کی دیکھ بھال کرنا جن کے یہاں کھانے کمانے کے ذرائع نہیں۔ میرا خیال ہے ان کی مدد کرنا اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ عمل ہے اور میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ آئندہ سے بڑے میاں کو بیس پچیس روپے ہر ماہ دیا کروں......'' کہتے ہوئے وہ باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ اس کے بعد سے بڑے میاں کو چندہ دیتے ہوئے زہرہ کے ذہن میں مسجد کا خیال کبھی نہ آیا ہوگا۔ کیوں کہ اب بڑے میاں کے ساتھ مسجد کا تصور اُس کے ذہن سے قطعی طور پر نکل چکا تھا اور اس کی جگہ بڑے میاں کا گھر آن بسا تھا۔ جس میں ان کی اکلوتی جوان بیٹی بیٹھی ہے' جو شادی کے قابل ہے اور جس کا انتظام بڑے میاں کو ہی کرنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ انتظام کب اور کیسے ہوگا یہ تو اوپر والا ہی جانے۔ جو اسباب بنانے والا ہے۔ جو خود بے حاجت ہو کر دوسروں کی ہر آن حاجت روائی اور ضرورتیں پوری کرتا ہے۔

ایک نئی کہانی

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　　جو چیرا تو قطرۂ خون نہ نکلا

کچھ حال اکیڈمیز کا ایسا ہی ہے۔ کیا کریں کہ ہونٹ بھی اپنے دانت بھی اپنے کہ الزام تراشی کی سزا کسے دیں۔

کہانی لکھتے ہوئے میں جس ناقابل بیان کرب میں مبتلا تھا اس کا احساس آپ کو کہانی پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔ آج کل ایسا کرب عوام کا مقدر اور نظم ونسق کے لئے باعثِ فخر بنتا جارہا ہے اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے کچھ نہ کریں تو بدعنوانی کو یوں ہی پلتے بڑھتے رہنے کے بھرپور مواقع ملتے رہیں گے۔

ہے نہ یہ عجیب بات کہ آج تک بھی ہماری اس اکیڈمی نے' ملک کی دیگر اکیڈمیوں کی کتابوں اور ناموں کی فہرست جو انعام پا چکے ہیں شائع کر دیتے ہیں' نہیں کی صرف چند ناموں کو چھوڑ کر ان کو اخبارات سے دور ہی رکھا۔ اب میں آپ کو اپنی کتاب کا نام بتلا دوں صرف آپ کی اطلاع کے لئے وہ "ڈھاک کے دو پات" ہے۔ آپ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ پہلا ہی ایڈیشن ہے چونکہ اس کے پانچ ماہ بعد ہی میں بیمار پڑ گیا تھا اور اب تک علیل ہوں۔ اردو اکیڈمی نے ذہنی طور پر جو زک مجھے پہنچائی ہے اُسے میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ کیا یہ داغ میرے ساتھ میری قبر میں جائیگا؟

دوپہر حمام سے نکلنے کے بعد کپڑے تبدیل کر کے کھانے کی میز پر پہنچا تو وہاں ایک کھلا لفافہ جو بُک پوسٹ تھا اور جس کو ہماری بہو ثمرین نے وصول کر کے میز پر رکھ دیا تھا میرا منتظر تھا۔ کیونکہ یہ میرے ہی نام تھا جلدی میں میں نے اُس میں سے وہ کارڈ نکال لیا جو ایک دعوت نامہ تھا ہمارے یہاں کی اردو اکیڈمی کی جانب سے جس میں ایک تقریب کے تحت اُن منتخب ادباء کو انعامات سے نوازا جانے والا تھا جنہوں نے اپنی کتابیں انعامات کے سلسلے میں پیش کی تھیں۔

میں نے بھی اپنی کتاب اکیڈمی کو پیش کی تھی اسی غرض سے لیکن دعوت نامے میں اس کا کوئی ذکر یا علیحدہ سے کوئی نوٹ نہیں تھا کہ آیا میں بھی اُن خوش نصیب مصنفوں میں شامل ہوں یا نہیں۔ خوشی و مایوسی کے ملے جلے جذبے کے تحت' جس تشویش نے مجھے کئی دنوں سے جکڑ رکھا تھا' میں جھنجھلا گیا چونکہ تقریب دو دن بعد ہی ہونے والی ہے اور میں ابھی تک اپنے بارے میں تاریکی میں ہوں۔

پچھلے کچھ دنوں سے روز صبح اخبار میں مجھے جس خبر کی تلاش تھی وہ یہی رہتی تھی کہ آخر اکیڈمی نے کن

کتابوں کو انعامات کے لئے منتخب کیا ہے۔

اسی جذبہ کے تحت ایک دن صبح صبح اخبار پڑھتے ہوئے جیسا کہ میری عادت بن گئی تھی میری نظر اخبار میں اکیڈمی کی طرف سے جاری کئے گئے ایک پریس نوٹ پر ٹھہر گئی۔ اُس میں بتلایا گیا تھا کہ اس سال' سال ۹۱ اور ۹۲ کے لئے کل بیس کتابیں سلیکشن کمیٹی کی سفارشات پر جو اکیڈمی کی جانب سے تشکیل دی گئی ہے۔ چن لی گئی ہیں۔ انعامات کے سلسلے میں لیکن اُس میں نہ ہی کتابیوں کی تفصیل دی گئی تھی نہ ہی ادباء کے نام' جن کو ایوارڈ سے نوازا گیا تھا میرا غصہ لازمی تھا' اس لئے میں نے جھلا کر اخبار کو ٹیبل پر ٹپک دیا تھا۔

ویسے ان دنوں بیمار ہوں ایک ایسی لانبی بیماری سے جس میں میرا باہر جانا آنا بھی میرے لئے دوبھر ہو گیا ہے اس لئے دل مسوس کر رہ گیا کہ شاید اخبار میں انعامات کی تفصیل جلد ہی آجائے گی لیکن تفصیل کو نہ آنا تھا۔ نہ آئی۔

اس طرح ناقابل بیان کرب اور کشمکش کے عالم میں پورا ایک ہفتہ گزر گیا پھر خبر آئی کہ اس مہینے کے اواخر میں انعامات کی تقسیم ہوگی۔ میری تشویش اور بڑھ گی' بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سوچنے لگا شاید یہ بھی ایک طرح سے گرامی ایوارڈ ہے جس کا انکشاف لمحہ' آخر میں ہوتا ہے۔ یہ بات میں نے اپنے بھائی سے کہی جو مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ ہنسنے لگے...... پھر انہوں نے سنجیدگی اختیار کر لی کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ آخر وہ پردہ داری کیا ہو سکتی ہے! میں سوچ میں پڑ گیا۔

آج دعوت نامے کو دیکھ کر تو میں کھول اُٹھا تھا اور اپنے بھائی کو بلوا بھیجا کہ جائیں اور پتہ کر آئیں کہ آخر بات کیا ہے چونکہ میں اپنی کتاب پر نازاں تھا اس بات سے کہ یہ انعام ضرور لے آئیگی۔ اس میں' میں نے آج کل کے بڑھتے ہوئے مذہبی جنون کی بھرپور عکاسی کی ہے اور اس میں جگہ جگہ ایسے مواقع فراہم کئے ہیں کہ پشیمانی کی راہ نکلتے نکلتے مذہبی جنون کی کیفیت جوان دنوں برقرار ہے اس سے فرار حاصل ہو اور قومی یکجہتی پروان چڑھے۔

بھائی صاحب پتہ کر آئے اور اطلاع دیتے ہوئے جھلا پڑے ''معلوم نہیں کس نے آپ کی کتاب کے آگے رجسٹر میں دوسرا ایڈیشن لکھ دیا ہے۔ سُرخی سے۔ اس لئے یہ مقابلہ سے دور الماری کے اوپر دھول میں اٹی پڑی رہی''۔

میں چونک پڑا ---!

''دوسرا ایڈیشن ---!'' اور مجھے لگا جیسے کسی نے ٹھیک میرے دل کے مقام پر ایک زبردست گھونسہ رسید کر دیا ہے۔ یہ دوسرا ایڈیشن کہاں ہے؟ کس نے کہا؟ اور کیوں؟

پھر میں نے اپیل لکھ کر بھائی صاحب کے ہاتھ بھجوائی کہ وہاں دے آئیں اکیڈمی میں۔

بھائی صاحب اپیل دے آئے اور کہنے لگے...... ''بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے آپ کے ساتھ آپ سوچ بھی نہیں سکیں گے کتاب کے متعلق فائل میں لکھ دیا گیا ہے کہ آپ نے نعوذ باللہ اندر کا صفحہ جس میں کتاب کے حقوق کے ساتھ دیگر تفصیلات درج ہوتی ہیں پھاڑ کر اس کی جگہ دوسرا صفحہ چھپوا کر جوڑ دیا ہے کہ پہلا ایڈیشن لگے''۔

میں کیا کہتا غصے سے کھول اٹھا---!

''میاں! کسی طرح تم مجھے وہاں لے چلو ابھی اور اسی وقت' میں دیکھوں گا انہیں۔

بھائی صاحب نے بے یقینی اور تعجب سے میری طرف دیکھا۔

''آپ چلیں گے وہاں''۔

''ہاں! کیوں نہیں' بستر مرگ پر تھوڑا ہی ہوں اگر اس وقت فرشتہ اجل بھی آجائے تو وقت مانگ لوں گا کہ بعد میں آنا' اب میں کام سے جا رہا ہوں' چلو۔ بڑی مشکل سے میں بھائی صاحب کے سہارے اُٹھا باہر نکل کر اسکوٹر کی پچھلی نشست پر آرام سے بیٹھ گیا۔

اکیڈمی میں بڑی گہما گہمی تھی۔ دونوں کو دیکھ کر سب چونک گئے! شاید اس لئے کہ وہ سب تھوڑی دیر پہلے ہی اس کارروائی سے واقف ہو گئے تھے۔ یعنی اس دھاندلی سے جس پر میری اپیل پہنچی تھی۔

اکیڈمی کا سارا عملہ ہی گومگو کے عالم میں اپنی اپنی سیٹیں چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا' ہم کو دیکھ رہا تھا۔

بھائی صاحب نے اشارہ سے ڈائریکٹر کا کمرہ بتایا یہ کہتے ہوئے کہ وہاں میری کتاب سے متعلقہ فائل اور اپیل دونوں ساتھ ہیں میں نے انہیں باہر ہی ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے چق ہٹا کر اندر داخل ہوا۔

ڈائریکٹر صاحب کرسی پر بیٹھے کسی سوچ میں غرق تھے۔ آہٹ پا کر انہوں نے میری طرف دیکھا' تیکھی اور ظالمانہ نظروں سے میری اپیل کتاب فائل سب کچھ ان کے سامنے ٹیبل پر رکھے تھے کچھ دیر پہلے تک شاید وہ اسی میں منہمک تھے اور اس کا اندازہ شاید انہیں نہیں تھا کہ میں چل کر اتنی جلدی اُن تک پہنچ بھی سکتا ہوں چونکہ وہ بلکہ سارا عملہ ہی جان چکا تھا کہ میں بیمار ہوں۔ آ نہیں سکتا۔

وہ نہایت افسرانہ دبدبے سے بیٹھے ہوئے جو کرسی از خود سکھلا دیتی ہے' تحکمانہ انداز میں منہ کھولے

''کون ہیں آپ؟''

میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

''جناب میں وہی ہوں جو آپ کے سامنے ٹیبل پر بے بس ولاچار پڑا ہوا اس الزام کے ساتھ کہ میں دغاباز و دھوکہ باز بھی ہوں۔''

''اوہ! آپ بیٹھئے''۔ انہوں نے گھور کر میری طرف دیکھتے ہوئے سامنے پڑی ہوئی کچھ کرسیوں میں

سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جناب!'' میں نے اپنی آواز کو متوازن رکھ کر جواب دیا''۔ میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا ہوں میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ اُن خطوط اور مراسلوں اور ان تمام کاغدات کا جو آپ کے نزدیک ناپسندیدہ ہوتے ہیں آپ کیا کرتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے ٹیبل کے نیچے ٹھیک آپ کے پیروں کے پاس تاروں سے بنی ایک ٹوکری ہے شاید ان تمام کو آپ اسی کے اندر جھونک دیتے ہیں۔ بڑی اچھی چیز ہے یہ جناب لیکن یہ میرے پاس نہیں ہے''۔

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ'' وہ ٹیبل پر پڑے ہوئے میرے اثاثے کو گھور کر دیکھتے ہوئے غصہ سے ابل پڑے۔

''کچھ نہیں، میں بھی استعمال کرنا چاہتا ہوں اسے'' مسکراتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کو پیچھے کھینچتے ہوئے جیب سے دعوت نامہ نکال کر اس کے چار ٹکڑے اس ٹوکری میں جھونک دیئے، جھک کر جس کو میں پہلے ہی راستے میں اسکوٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے ہی پھاڑ چکا تھا۔ پھر سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے نہایت مستحکم لہجہ میں جب کہ ڈائریکٹر صاحب آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہے تھے، بولا

''لیکن جناب! اشاراً اتنا بتلادوں کہ آپ میری اس اپیل کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کریں گے جس کی مجھے توقع ہے ہوسکتا ہے ہم پھر ملیں گے جلد ہی، لیکن کہاں؟ یہاں نہیں''۔

باہر نکلتے ہوئے میں پھر پلٹا، وہ حضرت کرسی میں دھنسے غصہ سے کھول رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف انگلی اٹھائی:

''کاش! اس دعوت نامہ کی جگہ آپ ہوتے اور میں آپ سے بڑا افسر'' پھر میں باہر نکل آیا۔

ڈائریکٹر صاحب کرسی چھوڑ کر جھلاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

باہر سب لوگ جو ہماری گفتگو سن چکے تھے، حیران و پریشان کھڑے تھے۔

بھائی صاحب آگے بڑھ آئے اور مجھے سہارا دیتے ہوئے وہاں سے لے آئے جبکہ شدت جذبات سے میری آنکھوں میں اندھیری آنے لگی تھی۔

راستے میں نہ ہی انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہ ہی میں نے انہیں کچھ بتلایا میں تمام راستے سوچ رہا تھا...... کیا قلم کاروں کی عزت و شرافت سے اس طرح سے کھلواڑ بھی کیا جاسکتا ہے۔ انعام سے زیادہ میں اس وقت اس بات سے مطمئن تھا کہ کم از کم میں نے ظلم، ناانصافی اور بدعنوانی کے خلاف اس حالت میں بھی اپنی روش چھوڑی نہ ہی مصلحت پسندی سے کام لیا۔ انعام کے لالچ میں نام کی خاطر ایک قلمکار کیلئے یہی بات، جو واقعی اپنے پیشے میں مخلص ہوں طرۂ امتیاز کا درجہ رکھتی ہے۔

پارٹیشن

کبھی پارٹیشن کسی ملک کا نہیں بلکہ غربت کا ہوتا ہے۔ تنگ نظری کا نہیں بلکہ تنگ دستی کا ہوتا ہے۔ یہ دلوں کو الگ الگ نہیں کرتا بلکہ جوڑتا ہے۔ کاش! ملک کے پارٹیشن بھی ایسے ہی ہوتے---

آفت یہ نہیں تھی کہ منا کے بچہ ہونے والا تھا بلکہ آفت یہ تھی کہ ابھی تو اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور تو اور رسم بھی نہیں ہوئی تھی اُس کی ابراہیم کے ساتھ جب کہ پہلی رسم ٹوٹ چکی تھی۔

یہی بات جب پھوٹی تو عطر کی طرح اُس کی مہک پھیلتی ہی چلی گئی---پھیلتی ہی چلی گئی---

منا کافی ڈیل ڈول کی اونچی پوری لڑکی تھی' چنانچہ اُس کا بھرا بھرا جسم اور پیٹ کئی مہینوں تک اس راز کو چھپائے رکھا بالآخر جب اس کا افشاء ہوا تو سبھوں نے ناک پر اُنگلی رکھ لی کہ بھلا اتنا بھی چور جسم......

بوا نے ناک بھوں چڑھا کر کہا---''اوئی ماں' ہماری بھی بچی پیٹ سے ہوتی تھی تو اُس کے ہاتھ پاؤں نہیں دیکھتے تھے لیٹتے ہوئے صرف پیٹ دیکھتا تھا مائی پیٹ---مٹکا جیسا پیٹ---''

عورتوں کو تجسس کا اس لئے بھی کوئی موقع ہاتھ نہ لگا تھا کہ بہ ذات خود ابراہیم اور منا ایک ہی گھر ہی رہتے تھے---

اب یہاں دونوں میں محبت کی داستان کچھ غیر ضروری سی لگتی ہے کیونکہ جب سے منا کی پہلی رسم ٹوٹی تھی تو وہ اتنی بکھر گئی تھی کہ چپ چپ رہنے لگی--- کچھ کم ڈیڑھ سال تک دولہا والوں نے اس پیغام کو اٹکائے رکھا تھا پھر جب انہوں نے جواب دیا تو طنزاً کہلا بھجوایا کہ ماشاء اللہ سے دلہن بیگم کے ہاتھ پیر تو خوب نکلے ہوئے ہیں لیکن دولھے کو اُن سے کوئی کشتی لڑنی تھوڑی ہے۔

منا کی ماں جو جگت خالہ تھیں اور ذرا منہ پھٹ' جھٹ بولیں---''اجی میں تو کہوں دم ہی نہیں ہوگا اُن کے ''اس'' میں---چلو اچھا ہی ہوا جو نہ مراد کی کمزوری ظاہر ہوگئی ورنہ ہماری بیٹی تو ہر دم پریشان ہی رہتی اُس کے ساتھ''۔

خالو جو منا کے والد تھے اور نشہ جم کر کرتے تھے وہ بھی خالہ کے ساتھ ہم پیالہ وہم نوالہ زہ کر بولے۔

''اور کیا---ناچنا نہ آئے آنگن ٹیڑھا اسی کو کہتے ہیں---''

''بس اب چپ بھی رہو---'' خالہ نے ترنگ میں آ کر جب کہ وہ بہت دیر سے پی رہی تھیں جام نیچے رکھ کر پلو سے ہونٹوں کو پونچھتے ہوئے کہا---

''اب تم بھلا کون سے ایسے بہادر نکلے تھے اُس رات--- وہ وہ تو ہم ہی تھے جو راستہ بتلا گئے تم تو انٹ شنٹ ادھر اُدھر کیسے سر مار رہے تھے۔''

خالو زور سے قہقہہ مار کر بہت دیر تک ہنستے رہے اور کھانستے رہے---

خالو جتنے ہی دبلے پتلے تھے خالہ اُتنی ہی موٹی تازی تھیں--- دونوں مل کر بیٹھتے تھے پینے پلانے کو تو ایسا لگتا تھا جیسے ایک گھاٹ پر شیر اور بکری پانی پی رہے ہیں--- کیونکہ خالہ پیتے پیتے خالو کو بار بار ایسے ہی ڈانٹ دیا کرتی تھیں کہ خالو صرف ہنس کر اور کھانس کر رہ جایا کرتے تھے۔

خالہ، خالو اور منا کے علاوہ گھر میں ابراہیم اُس کی ماں اور ایک شادی شدہ بھائی اسمٰعیل اور اس کی بیوی بھی رہتے تھے۔

ایک کشادہ دالان اور دو مختصر کمروں پر مشتمل یہ گھر تھا جس میں دالان کے بیچوں بیچ ایک پردہ ڈال کر شام میں وہ پارٹیشن کر لیا کرتے تھے۔

ابراہیم ٹیلر تھا وہ رات رات بھر مشین پر بیٹھا پارٹیشن کے ادھر لہنگے سیا کرتا تھا مزدوری پر---

جس رات ماں باپ کی نشیلی باتوں میں منا کو معلوم ہوا کہ اس کی رسم ٹوٹ چکی ہے تو وہ سر سے پیر تک لرز کر رہ گئی تھی پھر وہ اپنے اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی تھی اور چلا کر رو بھی نہ سکی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی نہ نکل سکے صرف آہیں تھیں جو منہ سے نکل رہی تھیں اور خیالات پارٹیشن کے ادھر مشین کی اُن آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو ابراہیم کے مشین چلانے سے پیدا ہو رہی تھیں......زرزر......

یہ اُس رات ہی کی بات تھی جب منا حلق کے سوکھنے سے پانی پینے کے لئے اُٹھی تھی تو سب کے سب گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے، خالہ چت پڑیں خراٹے لے رہی تھیں اور خالو ایک طرف کپا بنے پڑے ہوئے تھے اور پارٹیشن کے ادھر ابراہیم مشین پر بیٹھا زرزر لہنگے سی رہا تھا اسمٰعیل کمرے میں بیوی کے ساتھ لیٹا سو رہا تھا ماں دروازے کے بازو پڑی الگ خراٹے لے رہی تھی۔

منا اُٹھی اور بوجھل بوجھل قدموں سے دالان کے باہر آنگن میں گھڑے کی طرف بڑھی گھڑے سے گلاس اندر ڈال کر پانی نکالتے ہوئے ایک دم وہ سہم گئی......

مشین سے زرزر کی آوازیں یک لخت بند ہو گئی تھیں......تبھی وہ گھبرا کر ہٹی تو ابراہیم اُس کے سر پر تھا اور اُس کا مضبوط ہاتھ اُس کی کمر کے گرد کسا ہوا......

منا نے جب خود کو اس مضبوط گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی تھی تو پھر پہلوانوں کی طرح ہی ابراہیم نے اُسے اس کشتی میں چت کر ڈالا۔ پھر فتح کا نقارہ اُس وقت ہی بجا جب منا کا پیٹ معمول سے کچھ زیادہ اونچا رہنے لگا......

خالہ، خالو کو اس سے پہلے بھلا اس بات کا کیا علم ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ نشے میں دُھت رہا کرتے تھے......اور انہوں نے اپنے اس شوق کو مزید تقویت دینے کی خاطر پہلی رسم کے ٹوٹنے کے بعد منا کو ایک بڑی رقم کے عوض باہر بیاہنے پر بالکل تیار ہو چکے تھے۔ اور ایک جگہ شادی کی بات بھی پکی ہو چکی تھی اور آدھی رقم بطور بیانہ وہ لے بھی چکے تھے---

جب انہیں منا کی اس کیفیت سے آگاہی ہوئی تو خالہ تو سر پیٹ کر رہ گئیں اور خالو یوں چپ سادھ بیٹھے جیسے وہ کھانستا ہی بھول گئے ہوں---

خالہ نے رات میں رازداری سے کام لیتے ہوئے خالو کے کان میں کہا---

''اب بھی کچھ نہیں گیا--- میں نے دایہ کا انتظام کر لیا ہے وہ ٹھیک ڈھنگ سے سب کچھ صاف کر دے گی---''

''لیکن میری مانو تو منا سے پوچھ لو کہ آخر یہ ماجرا ہے کس کا'' خالو بھُنبھنائے---

خالہ یک دم بھڑک اُٹھیں---

''مجھے پوچھنے کی کچھ ضرورت نہیں---تم تو بالکل بچہ ہو بچہ......ہوگا ماجرا کس کا-- اتنا بھی نہیں معلوم کہ گھر میں کون مرد ہے۔''

خالو کی تب بات سمجھ میں آگئی تو ان پر کھانسی کا ایسا دورہ پڑا ایسا دورہ پڑا کہ وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو گئے اور قبل اس کے وہ ٹھیک ڈھنگ سے بات کرنے کے کچھ قابل بھی ہوتے خالہ مدہوش ہو کر بستر پر گر چکی تھیں اور منا بستر پر لیٹی چت پڑی ہوئی اپنے مٹکہ جیسے پیٹ پر ہاتھ رکھے اس حرکت کو محسوس کر رہی تھی جو بچے کے پیٹ میں ہونے سے تھی اور اُس کے کان پارٹیشن کے ادھر مشین کی صداؤں پر لگے ہوئے تھے جو ابراہیم کے مشین چلانے سے پیدا ہو رہی تھیں......زر......زر......

منا نے آوازوں کے ان جل ترنگ پر مسکرا کر دھیرے سے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر کے خیالوں میں لوریاں دینے لگی جب کہ ابراہیم تیز تیز پیر چلاتے ہوئے مشین پر اس طرح ہی لگ رہا تھا جیسے وہ دوڑتے ہوئے آ کر منا سے چمٹ جانا چاہتا ہے۔

ڈارون نے انسانوں کو بندروں کی ترقی یافتہ شکل بتلایا ہے خواہ کچھ ہو۔ خصلتوں و عادتوں میں اس کی تحقیق اکثر دیکھنے کو ملتی ہے جب انسان حد سے گذر جاتا ہے۔---

رام بابو سے میری ملاقات اس وقت ہوئی' جب میں سرکاری کام سے بلدیہ آفس میں رہائشی مکانات کی فہرست مرتب کرنے کی غرض سے وہاں متعین کیا گیا تھا۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ وہاں کے ریکارڈ سے مکانات کی ایک فہرست کی ایک نقل اپنے دفتر کیلئے تیار کروں۔ جس کی بنیاد پر ہی حکومت کچھ ایسے اقدامات کرنے والی تھی۔ جس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہوگا---!

کام چونکہ بڑا ہی غیر دل چسپ تھا۔ بلکہ صحیح معنوں میں گڑے مُردے اُکھاڑنے کے مترادف۔ اس لئے میں جلد ہی اس کام سے اُکتانے لگا۔ کہ رام بابو کی شخصیت نے اس کام میں میرے لئے دلچسپی پیدا کردی وہ یوں کہ میں ان کی دلچسپ باتوں سے حظ اُٹھانے لگا۔ اور میرا وہ غیر دلچسپ کام آہستہ آہستہ تکمیل کے مراحل کی طرف بڑھنے لگا۔

رام بابو ہیں تو آفس سپرنٹنڈنٹ' لیکن وہ اپنے تمام اہل کاروں سے اتنے گھلے ملے ہوئے رہتے ہیں کہ اونچی کرسی اور نیچی کرسی کا کوئی فرق ان کے یہاں رہتا نہیں۔ سب کی کرسیاں ایک جیسی ہوتی ہیں اور سب کے ٹیبل ایک جیسے۔ تب تو وارد کے لئے جو رام بابو کا پتہ اُٹھا کر کسی کام کے سلسلے میں آفس میں قدم رکھتا' جو ان کو نہ پہچانتا ہو وہ اُن سے ہی پوچھ بیٹھتا...... کہ "جناب! آفس سپرنٹنڈنٹ رام بابو کی نشست کدھر ہے۔......؟" ایسے وقت رام بابو ہنس دیتے اور کہتے ...... "ہاں جناب! آپ اس وقت اُن ہی سے بات کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں......" تو وہ کھسیا سا جاتا۔

بہرحال رام بابو ہیں ایسے ہی دل چسپ آدمی ...... پہلے پہل تو انہیں دیکھ کر یہی خیال مجھے سوجھا تھا کہ...... یہ تو اپنے ہی میاں بھائی ہیں۔ لیکن جب اُن کا مجھے نام معلوم ہوا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "ماشاءاللہ!"

تب رام بابو نے ہنس کر بتایا تھا۔ ''بھئی ایسا مغالطہ تو ہر کسی کو ہوتا ہے اب میں کیا کروں؟ اپنے طور سے چہرے کو مذہبی رنگ دینا میں پسند نہیں کرتا...... بس میری تمنا تو یہی رہتی ہے کہ بنی نوع کے کسی کام آسکوں۔ چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب یا فرقہ سے کیوں نہ ہو''۔

یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے جب بلدیہ آفس میں متعین ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے شہر کی فضا بڑی مکدر تھی......یعنی ایسی فضاء شہر کی اس وقت ہو جاتی تھی' جب شہر میں کوئی بھی جلوس نکلنے والا ہوتا تھا۔ گرچہ وہ سیاسی نوعیت کا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وہ سیاسی صورتحال اختیار کر لیا کرتا تھا۔!

ہر بار کی طرح اس بار بھی جلوس نکلنے والا تھا۔ تو اس بار بھی اُمید تھی کہ ایک دو ہفتہ کا کرفیو تو ضرور ہی لگیگا۔ چنانچہ ہر وہ شریف آدمی' اس سے خاصا پریشان تھا' جو مار دھاڑ اور دنگوں سے گھبراتا ہو۔ ہمیشہ اسی قسم کے جلوسوں میں لوٹ' مار' آتش زنی تو معمولی بات رہی' نوبت چھرے بازی تک پہونچ جاتی اور پولیس کا رول اس میں ایسا ہی رہتا جیسے کلاس کے ایک ہم عمر لڑکے کا --- جس کو کلاس کی مانیٹری شب ہاتھ میں ایک تپلی سی چھڑی دے کر دے دی گئی ہو اور وہ اس تپلی چھڑی کو بار بار ہلاتا لڑکوں کو خاموش بٹھانے کی کوشش میں چیختا رہتا ہو۔ لیکن...... حاصل کچھ نہیں۔

چونکہ دوسرے ہی دن جلوس نکلنے والا تھا۔ اس لئے اخبارات کے ذریعہ سے حکومت نے یہ وارننگ دے دی تھی کہ جلوس میں کسی بھی گڑبڑ کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ امن و امان کو بحال رکھنے کے لئے دیگر کئی ریاستوں سے کئی ڈویژن فورس منگوائی گئی ہے۔ جو پوری طرح مسلح ہے۔

ہوٹل میں رام بابو اخبار اپنے سامنے رکھے۔ ٹیبل پر چائے کی پیالی سے اُٹھتے ہوئے بھاپ کے مرغولوں کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھ کر اخبار کی اُس خبر پر اُنگلی رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئے......

''کیا تم نے یہ خبر پڑھی ہے''؟

میں نے کہا --

''ہاں پڑھی ہے۔ لیکن تبصرہ تو آپ ہی کو کرنا ہے......''

وہ ہنسنے لگے۔ پھر بولے۔

''دیکھو! کئی ڈویژن فورس' جس کے ہاتھوں میں بندوقیں ہوں گی۔ لیکن...... وہ فورس اس سے کیا کام لے سکے گی بھلا --- پھر بھی ان فورس والوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں کارآمد ہو سکتی تھیں لیکن بندوقیں ان کے ہاتھوں میں بے ضرر سی چیز ہوں گی کیوں کے یہ جس ڈور سے بندھی رہتی ہیں' ان کا سرا کسی دوسرے کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ جو ہمیشہ پردے کے پیچھے رہتے ہیں۔ جس طرح کٹھ پتلیوں کو نچانے والا۔

نظر نہیں آتا اسی طرح وہ بھی نظر نہیں آتے......!''

میں نے یاد دلایا۔

''ہاں کئی ڈویژن فورس جو اسلحہ سے آراستہ نظم وضبط کی بحالی کے لئے تیار تھی۔ وہ پچھلے جلوس کے موقعہ پر بھی موجود تھی۔ لیکن...... جب جلوس میں بھگدڑ مچ گئی اور جلوس والے گزرتے ہوئے راہ میں آئی اُن تمام دوکانوں کو لوٹتے رہے اور انہیں جلاتے رہے تو ایک بھی گولی چلنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی...... بلکہ یہ ایک ایسے جنونی بادشاہ کا کارنامہ لگ رہا تھا۔ جو اپنی خواب گاہ کی کھلی کھڑکی سے قہقہے لگاتے ہوئے لپکتے ہوئے شعلوں کا رقص دیکھ رہا ہو......

رام بابو یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ اور بولے......

''دیکھئے جناب! یہ بات ٹھیک نہیں ہوگی کہ ہم شہنشاہیت پر حرف رکھیں اور اپنے گریباں میں منہ ڈال کر نہ دیکھیں کیوں کہ ان دنگوں پر جو انکوائری کمیشن بٹھایا گیا تھا اور جس کو تحقیقات کی ذمہ داری سونپی گئی تھی' اس میں قابل افراد تو تھے ہی لیکن دانستہ یا شاید نادانستہ طور پر اُن لوگوں نے اس بات کا خیال کیوں نہ رکھا کہ جب اتنے ڈویژن فورس بھی جلوس کے ہمراہ تھی تو کیا اس کی بندوقوں میں گولیاں نہیں تھیں یا پھر وہ بندوقیں تھی ہی نہیں بلکہ بلوائیوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے ناٹکوں میں استعمال کئے جانے والے کھلونے تھے۔ دراصل انکوائری کمیشن میرے نزدیک ہوتا کچھ نہیں' بلکہ مٹی کا ایک ایسا شیر ہوتا ہے جس کو چوراہے پر گھڑ کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ جس پر پیلا رنگ کسی نے کیا ہے اور کالے رنگ کے پٹے کسی نے کھینچے ہیں''۔

رام بابو جب کبھی کسی واقعہ کا تجزیہ کیا کرتے تو وہ کچھ ایسی ہی مثالیں دیتے تھے کہ سننے والے کو کہنے کے لئے کچھ بن ہی نہ پڑتا تھا اور وہ لاجواب ہو جاتا ہے۔

مجھے بھی اس تعلق سے کیا کہنا تھا۔ اس لئے خاموش ہو رہا اور گھڑی دیکھنے لگا۔

جس وقت ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تھے اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ اب وقت کافی ہو چکا تھا یعنی لگ بھگ سات بج چکے تھے اس کے باوجود رام بابو کو شاید گھر پہنچنے کی اتنی جلدی نہیں تھی۔ اس لئے وہ جلوس جلسوں اور فسادات پر مدلل بحث کرتے ہوئے مثالوں پر مثالیں دئے جا رہے تھے اور میں اس بحث سے اُکتا تو نہیں گیا تھا لیکن یہاں سے اُٹھ جانا ضرور چاہتا تھا۔ اس لئے کہ ہوٹل میں تمام ٹیبل ہی گاہکوں سے پُر ہو چکے تھے اور لوگ تھے کہ ابھی آتے ہی چلے جا رہے تھے اور اس کا زیادہ امکان تھا کہ کرسیاں کم پڑ جائیں گی...... چنانچہ میں نے رام بابو سے کہا ''چلئے! اب گھر چلنا چاہیے۔ یہاں پر بیٹھے ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے۔''

رام بابو میری اس بات کو نظر انداز کر گئے اور بولے۔

''کئی دنوں سے فسادات کے تعلق سے ہمیشہ ایک ہی بات میرے ذہن میں رہی ہے اور وہ یہ کہ اس میں جو درندگی بڑھ جاتی ہے تو اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ...... درندوں کا جنم بھی انسانوں میں ہوتا جارہا ہے۔ کہتے ہوئے رام بابو ایک لمحہ رُک کر یوں میری طرف دیکھنے لگے' جیسے انہیں میرے چہرے پر غیر یقینی کی سی کیفیت کا علم ہو گیا ہو۔ چنانچہ وہ مجھ سے پھر مخاطب ہوئے۔

''خیر اپنے مذہبی اعتبار سے آپ اس بات کے قائل تو نہ ہوں گے۔ لیکن میں آپ کے سامنے اُس تاریخی واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک بار اپنے ایک مرید کو حضرت برہنہ شاہ قبلہ نے اپنے بغل میں لے کر انسانوں کی حقیقت بتلا دی تھی۔ جو کتے بلیوں کی شکل میں تھے......''

فسادات میں درندگی پر یہ ایک ایسی کامیاب مثال تھی کہ مجھ سے کچھ جواب دیتے نہ بن پڑا تو میں اپنے اطراف واکناف میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔

اطراف واکناف میں بیٹھے ہوئے وہ سبھی لوگ نہ جانے کیوں مجھے جانوروں کی طرح ہی لگنے لگے ......کوئی چائے پی نہیں رہا تھا بلکہ جانوروں کی طرح سڑپ رہا تھا......کوئی بے تحاشہ گلا پھاڑتے ہوئے اپنے کسی دوست کو گالیاں دینے میں مصروف تھا......کوئی زور زور سے ٹیبل کو پیٹتے ہوئے بیرے کو بلا رہا تھا۔ تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی --- تب ہی کاؤنٹر پر کچھ گڑبڑ سی ہوئی تو میں نے دیکھا۔ وہاں ایک پہلوان قسم کا گاہک چاقو کی نوک پر نہ صرف مینیجر سے فحش کلامی کر رہا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اُس سے ہوٹل کے بل کے پیسے نہ طلب کئے جائیں ورنہ......وہ یہیں کاونٹر پر مینیجر کی انتڑیاں باہر نکال کر اُس کے ہی گلے میں ڈال دے گا۔

یہ سب نظارے ایسے ہی تھے کے اس میں ہی مجھے جلوس میں ہونے والی شدت پسندی کا خیال آ گیا ...... چنانچہ میں نے تصور میں دیکھا کہ جلوس میں شامل لاکھوں افراد کے جم غفیر میں ہر کوئی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہے۔ کوئی دوکان لوٹ رہا ہے۔ کوئی پان کے کھوکوں کو زمین بوس کر کے انہیں نذر آتش کر رہا ہے......کوئی سبلوں سے دکانوں کے شٹروں کو اُکھاڑ کر ان کے اندر کپڑوں کے جلتے ہوئے ٹکڑے پھینک رہا ہے۔ میں نے تصور میں یہ بھی دیکھا کہ جانوروں کا ایک شوریدہ سر ریوڑ کھیتوں کی باڑھ کو توڑ کر کھیتوں کے اندر گھس آیا ہے اور کھڑی فصل کو تباہ وتاراج کر رہا ہے...... یہ دنوں تصورات میرے ذہن میں کچھ اس طرح یوں جلدی جلدی آپس میں گڈمڈ ہونے لگے کہ مجھے ان میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آنے لگا کہ ان میں جانور کون ہے اور انسان کون......!

رام بابو بھی شاید اسی شش وپنج میں مبتلا تھے چونکہ وہ ہوٹل میں ہو رہے ہنگاموں سے کافی جھلائے

ہوئے تھے۔ چنانچہ حیوانوں کی اس بستی سے جب ہم دونوں باہر نکل رہے تھے تو رام بابو کچھ سوچتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے......

''برادر! ٹھیک تو یہی ہوگا کہ اب ایک آدھ مہینے کے لئے ہم درندوں کی اس بستی کو ہی خیر باد کہہ دیں اور گاؤں چلے جائیں ...... اور میں آپ کو یہ بتلا دوں کہ میں کل ہی سے رخصت پر اپنے گاؤں جا رہا ہوں......میں نے اس کے لئے آفس سے چھٹی بھی لے لی ہے......؟!

میں چونک کر رام بابو کی طرف دیکھنے لگا۔ چونکہ رام بابو ساتھ نہیں ہوں گے تو وہاں بیٹھ کر کام کرنا میرے لئے کتنا دوبھر ہو جائے گا۔ تب ہی میں نے بھی ارادہ کرلیا کہ ٹھیک ہے۔ میں بھیپائی پوسٹ اپنی طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر رخصت کی درخواست بھجوا دوں گا اور تعلقہ وقار آباد چلا جاؤں گا کہ وہاں رہ کر دل بھر آم کھا سکوں، جہاں کی تحصیل میں کچھ کم پانچ سال کارگزار رہا تھا۔

لیکن ایک لمبے عرصے کے لئے رام بابو سے جدا ہونے کے خیال سے ہی میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے اور میں شکستہ دل ہو گیا۔

رام بابو نے میری اُس کیفیت کو فوری بھانپ لیا۔ پھر قبل اس کے کہ میں ان کی طرف دیکھتا ان کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک آئے۔ اور وہ مجھ سے رخصت لے کر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔

میں دیر تک کھڑا رام بابو کو اپنی نظروں سے اوجھل ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔

سورج اب غروب ہونے لگا تھا۔ آسمان پر شفق کی لالی پھیلی ہوئی تھی اور روشنی کا وہ گولا آہستہ آہستہ میری نظروں سے غائب ہوتا جا رہا تھا تو اطراف و اکناف میں تاریکی کا احساس بڑھنے لگا......لیکن مجھے ساتھ ساتھ اس کا بھی یقین تھا کہ رات کے بعد صبح ضرور طلوع ہوتی ہے۔ چونکہ یہی قدرت کا نظام ہے۔ بھلا اس سے کسی کو انکار کیسے ہو سکتا ہے......!

جب بھی الیکشن کی آمد آمد ہوتی ہے۔ یعنی الیکشن کا سرمائی بخار شروع ہونے والا ہوتا ہے۔ اس میں عوام ہی متاثر ہوتے ہیں۔ اور علاج میں انہیں کرفیو کے ٹبلیٹ اور گولیاں دی جاتی ہیں۔ لیکن مرض کا مچھریوں ہی بھنبھناتا ہوا اُڑتا شفاف ٹھہرے ذہنوں پر اپنا لارا پھیلاتا انسانی نسل کو متاثر کرتا رہتا۔ نہ انہیں سکون سے سونے دیتا ہے' نہ بیٹھنے دیتا ہے۔ یہ ہے ہماری موجودہ تاریخ جو انسانی خون' بچوں کی چیخ و پکار اور بیواؤں کی آہ و بکا سے عبارت ہے۔ کاش! ہم اس پر بھی توجہ دیتے کہ ہماری تاریخ اس طرح سے عبارت نہ ہو۔ دہشت گردی میں۔

دراصل عظیم ہندوستان کی کچھ ناپسندیدہ وشر پسند تنظیمیں نت نئے ڈھنگوں سے اس کی یکجہتی و یکتا کو متاثر کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ جس میں ''بابری مسجد'' ایک ایسا ہی سانحہ ہے جس کو ڈھا دیا گیا۔ پھر میدان عیدگاہ ہبلی پر قومی جھنڈا الہرانے کا دوسرا شاخسانہ' اگر روک دیا گیا نہ ہوتا تو دوسرا سانحہ ہوتا بہر حال ''9 گھنٹے'' ناواقفیت' نااندیشی' عہد شکنی' دھوکہ دہی کے طویل ترین لمحات ہیں جو 6/ڈسمبر 1992ء کے دن صبح سے شام تک جاری تھے کئی ڈیویژن فوج کے ہوتے ہوئے۔

ھری ناتھ کسی بھی پارٹی کے سرگرم کارکن نہیں تھے لیکن ہر پارٹی سے واقف تھے کہ کون کتنے پانی میں ہیں۔ خصوصاً دھارمک پارٹیوں کے قریب جانے سے بھی وہ بدکتے تھے کہ اچانک کب انجانے میں انہیں کہیں دولتی نہ پڑ جائے۔

اگرچہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن جہاں دیدہ و باشعور تھے۔ یہی سبب تھا کہ ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ وہ ان کی پارٹی میں شامل ہوجائیں' لیکن وہ کسی کا بھی دل توڑنے کے بجائے ہنس کر ٹال مٹول سے کام لیتے کہ وہ اس بارے میں غور کریں گے۔

جس محلے میں وہ رہتے تھے وہاں دھارمک پارٹیوں کا بڑا زور تھا۔ اُس دھارمک پارٹی کا خصوصاً زیادہ جو مندر مسجد تنازعہ اُچھال کر برسر اقتدار آنا جس کا مقصد تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس پارٹی کا ساتھ

بھی دیں۔ لیکن مجبور تھے کہ وہ ان کے بیچ گھرے ہوئے تھے۔

ایک دن اس پارٹی کے صدر اُن سے ملنے آئے۔ انہوں نے اپنی گول گول بلوں والی عینک کو چھوٹی سی ناک کے پھندنے پر بائیں ہاتھ کی انگلی سے اُوپر جماتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''ہم بڑے پیمانے پر کارسیوکوں کو جمع کر رہے ہیں۔ ایودھیا مارچ میں وہاں یگنہ کرانا ہے صرف دھارمک اشلوک پڑھے جائیں گے وہاں برہمنوں کے بیچ اس چبوترے پر جس کا نرمان ہو چکا ہے۔ میں تمہیں یگنہ میں شامل رہنے کی دعوت دینے آیا ہوں''

ہری ناتھ نے بے یقینی سے اِن کی طرف دیکھا جن کے ساتھ باڈی گارڈ کے طور پر یک مضبوط جسم کا پستہ قد سیوک گلے میں گن ڈالے سر پر کپڑے کی سیاہ ترچھی ٹوپی اوڑھے' سیاہ ڈھیلے ڈھالے نیکر میں ملبوس چاق وچوبند کھڑا تھا۔ اس کو صدر نے ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا۔ پھر رازداری سے صوفے پر بیٹھے ہری ناتھ کے اور قریب کھسک آئے۔ ''دیکھو ہری ناتھ اب تم سے کیا چھپانا ہم نے حکومت وسپریم کورٹ تک کو یہ یقین دلا رکھا ہے کہ وہاں صرف پوجا ہوگی' اشلوک پڑھے جائیں گے یگنہ میں اور کچھ نہ ہوگا''

ہری ناتھ نے تاہم ایک ٹھنڈی سانس کھینچی' ''ٹھیک ہے'' پھر بھی وہ بے یقینی سے بولے ''لیکن تم لوگ عوام کے جذبات وخیالات کو مکروفریب کا جھوٹا شاخسانہ دے کر کچھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ حصول ووٹ کی خاطر ملک کی سالمیت اتحاد و یکجہتی جیسی خانقاہیں نیست ونابود کر دی جائیں یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے جب اکثریت برسراقتدار ہو تو اِن پر یہ زائد ذمہ داری ازخود عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اقلیتوں کی جان ومال اور ان کے مذہبی کا زو عبادت گاہوں کی بھرپور حفاظت کی جائے۔ یہ ہماری دستوری ذمہ داری بھی تو ہے''۔

''بس---بس---تم میں یہی ایک خرابی ہے' ہری ناتھ کہ تم جو کچھ کہتے ہو اس سے ہم لاجواب ہو جاتے ہیں' صدر نے جھلا کر کہا...... ''سچ پوچھو تو تم دوسرے گاندھی ہو...... بابائے قوم! صدر کا لہجہ کسیلا تھا۔

''ہاں---لیکن دوسرا ہٹلر نہیں'' ہری ناتھ نے بھی طنز کا تیر چھوڑا۔

''خیر چھوڑو'' صدر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے ''ایودھیا آنا ضرور۔ یہی بولنے آیا تھا۔ تاریخ یاد ہے نا 6رڈسمبر..........''

6رڈسمبر ہری ناتھ نہ چاہتے ہوئے بھی ایودھیا پہنچ گئے۔ وہاں ہر ریاست' ہر گاؤں' ہر گلی کوچے سے آئے ہوئے لاکھوں کارسیوکوں کا مجمع تھا۔ وہ دھاچوکڑی مچی ہوئی تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

ایک اونچے سے چبوترے پر جو کچی اینٹوں و پتھروں سے نو تعمیر شدہ تھا' برہمنوں کا ایک جمگھٹا اس چبوترے پر براجمان اپنے ہونٹوں کو بدبداتے گلے میں پڑے جینو کو ہاتھوں سے کھیلتے ننگے بدن و پیٹوں کو ہلاتے' ایک سی مخنی و بیٹھی آوازوں میں وہ سب اشلوک پڑھ رہے تھے۔ رہ رہ کر چاروں طرف سے چبوترے کو گھیرے کھڑے لاکھوں کارسیوکوں کا مجمع ہاتھوں میں پکڑے ترشول کو بار بار ہلاتے ''رام سیارام'' کے نعرے لگا رہا تھا۔ ان سب سے الگ تھلگ کھڑے ہری ناتھ اوٹ پٹانگ کے سے شور شرابے و گڑبڑ کی سی آوازوں پر یکدم چونک پڑے یہ آوازیں بہت دور سے آ رہی تھیں۔ ان آوازوں پر چبوترے کو گھیرے کھڑے کارسیوکوں کے مجمع میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب برہمنوں کے پڑھے جانے والے اشلوکوں پر کان دھرنے کے آوازوں کی سمت دوڑنے لگے--- ہری ناتھ حیران پریشان کچھ دیر تلک کھڑے رہے' لیکن ان سے بھی رہا نہ گیا وہ بھی ان سب کے پیچھے ادھر ہی ہو لیئے۔

قریب پہنچتے پہنچتے جو منظر ان کی نظروں کے سامنے آتا جا رہا تھا وہ فوجی جوانوں کے گھیرے کو توڑتا ہوا کارسیوکوں کا غول کا غول مسجد کی گنبدوں پر چڑھتا جا رہا تھا پہلے ہی توڑ پھوڑ کی کارروائی جاری تھی۔......

وہ قریب پہنچ کر حیران کھڑے رہ گئے۔ اور چاہتے تھے کہ آگے بڑھ کر کچھ اُپدیش دیں اس جنونی کارروائی کو روکنے۔ کہ پارٹی صدر نے جو ان کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے ان کے ہاتھ کو تھام لیا اور غصے سے بولے ''کیا کر رہے ہو' ہری ناتھ! تم ہوش میں تو ہو......''

جھٹکے سے ہری ناتھ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''ہاں میں ہوش میں ہوں۔ تم ہوش میں کہاں ہو......! کیا ہوا وہ تیقن جو تم نے حکومت و سپریم کورٹ کو دے رکھا تھا۔ کیا یہی پوجا ہو رہی ہے یہاں تم سب دھوکے باز ہو''۔

''دوسرا گاندھی!'' پارٹی صدر نے دانت پیستے ہوئے سانپ کی طرح بھکارا تبھی سنسناتی ہوئی گولیوں کی ایک بوچھار ہری ناتھ پر آ پڑی۔ کرب کے عالم میں گاندھی کی طرح ہی سینہ پکڑے کپکپاتی ہوئی آواز میں ہری ناتھ کے منہ سے نکلا'' ہے رام!'' اور وہ آواز کی سمت پلٹے اور لڑکھڑاتے گرتے گرتے دیکھا جہاں وہی سیوک گن کا رُخ کیئے کھڑا جبڑوں کو سختی سے بھینچے ہوئے تھا۔ ادھر سے منہ موڑے ہری ناتھ گرتی ہوئی گنبدوں کی طرف ہاتھ جوڑے زمین پر وہیں ڈھیر ہو گئے۔

کچھ لوگ جو وہاں جمع ہو گئے تھے گولیوں کی بوچھار پر دہشت کے عالم میں کائی کی طرح چھٹ گئے۔ پھر اس جنون و ہڑبونگ میں کسی کو کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہوا۔ سب ڈھائے جاتے ہوئے گنبدوں کی طرف ہی متوجہ تھے۔ اور زیادہ تر کیمرے وہیں مصروف تھے۔

موقع دیکھ کر ہڑ بڑاہٹ میں جھٹ پارٹی صدر نے پلٹ کر اپنی شال ہری ناتھ کے بے جان جسم پر ڈال دی اور سیوک سمیت خود کو اس منظر سے دور کر لیا لیکن وہ کیمرے کی تیسری آنکھ سے بچ نہیں سکے۔

دوسرے دن انگریزی اخبار کے ایک صفحہ نے خبر کے ساتھ ان کو پکڑ ہی لیا۔

وہ جھلاتے ہوئے اخبار کو ٹیبل پر پٹک کر اُٹھ کھڑے ہوئے ''کس نے دی یہ خبر''۔

خبر میں ہری ناتھ کی لاش کی فوٹو کے ساتھ ان کو قتل کے معاملے میں ملوث بتلایا گیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ لاش پر اُڑھائی گئی شال ان ہی کی تھی۔

اسی اخبار میں چھپی اس دوسری فوٹو پر جو مسجد کے ملبہ پر ایک عارضی مندر کی تھی جس پر بھگوئے رنگ دوشاخہ پرچم اپنی زبان ہلاتا مسلسل نو گھنٹے کی ظلم و استبداد کی کہانی سنا رہا تھا' توجہ کا باعث بنی ہوئی تھی اور فوٹو کے نیچے لکھا تھا کئی ڈیویژن فورس وہاں کیوں متعین کی گئی تھی اور کس لئے''۔

صدر نے طیش میں آکر اخبار کو پلٹا اور فون نمبر لے کر اُس انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کو فون کھڑکھڑایا اور پہلے نامہ نگار کو ایک گندی گالی دی جس نے بھی یہ رپورٹ دی تھی۔ اور کہا'' کیا یہ خبر صحیح ہے جس میں مجھے قتل کے معمہ میں ملوث بتلایا گیا ہے''۔

ایڈیٹر پرسکون انداز میں کہا'' جناب! آپ نامہ نگار کی رپورٹ پر نہ جایئے بلکہ یہ دیکھئے کہ کیمرے کی آنکھ نے کیا دیکھا ہے۔ رپورٹ غلط بھی ہوسکتی ہے لیکن کیمرے کی آنکھ نہیں۔ پھر دوسری فوٹو کے نیچے جو لکھا ہے کیا وہ صحیح نہیں کہ کئی ڈیویژن فوج وہاں کیوں اور کس لئے متعین کی گئی تھی''۔

صدر نے جھٹ فون کو کریڈل پر پٹک دیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بھلا اس سچائی کا ان کے پاس کیا جواب ہوسکتا تھا۔ اور اسکا بھی کیا جواب کہ مسجد کی بے حرمتی نہیں ہوگی صرف یقینہ ہوگا جس کا تیقن حکومت و سپریم کورٹ کو دیا گیا تھا کدھر گیا وہ مسلسل 9 گھنٹے کی دہشت گردی میں؟

مجرم قانون کیلئے ہمیشہ دردسر بنے رہے ہیں کیونکہ یہ کبھی کسی نہ کسی طاقت کے سرچشمے ہوتے ہیں ان کو توڑنا یا کاٹنا کسی شہہ زور ندی پر بندھے بندھ کو ڈھانا جیسا ہے۔

کوئی اس بات پر متفق ہو یا نہ ہو' لیکن انسپکٹر منجریکر کو اس بات کا خاصا تجربہ تھا کہ فسادات میں مجرم پر قانون کی گرفت مضبوط نہیں رہتی...... یہاں مجرم اگرچہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا بھی رہتا ہے' اس پر جرح بھی ہوتی ہے...... لیکن وہ کٹہرے سے باہر آتا ہے تو باعزت طور پر بری ہوتا ہے اس پر وہ مٹھائی بانٹتا ہے' خوشیاں مناتا ہے' اس لئے نہیں کہ اس نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک دی ہے' بلکہ اس لئے کہ عدالت کی میزان کا پلڑا بھی سیاسی مداخلت اندازی کے سبب اس کے حق میں جھک گیا ہے۔

منجریکر کا اگر بس چلتا تو وہ اس بات کو جلی حرفوں میں چھپوا کر کرسی کے پیچھے دیوار پر چسپاں کروا دیتا' کیوں کہ اس نے حالیہ فسادات میں گرفتار ہوئے کئی مجرموں کو عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا' لیکن ہر بار ہی سیاسی مداخلت اندازی نے مجرموں کو نہ صرف عدالت سے باعزت بری کروا دیا تھا' بلکہ مجرمین نے رہائی کی اس خوشی میں عدالت کے تما حلقوں میں مٹھائی بھی بانٹی تھی۔ اور بعض مجرمین تو اتنے دلیر تھے کہ وہ انسپکٹر منجریکر کو بھی مٹھائی دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ تب اس پر جھلاہٹ کا اتنا زیادہ دورہ پڑتا تھا کہ کئی بار تو اس نے یہ مٹھائی مجرموں کے منہ پر پھینک ماری تھی۔

اس بار پھر سیاسی اتھل پتھل کے سبب فسادات کا سلسلہ چل نکلا اور جگہ جگہ دن دہاڑے قتل ہونے لگے تو انسپکٹر منجریکر بہت زیادہ چوکنا ہو گیا...... اس بار وہ چاہتا تھا کہ مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر وہ انہیں پھانسی کے تختے تک پہنچا دے۔

چنانچہ رات کے وقت کرفیو میں جبکہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا' وہ فساد زدہ علاقے میں' گشت لگانے جیپ میں اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا......

اسکی جیپ سنسان سڑک کے سینے پر دوڑتی چلی جا رہی تھی کہ ایک گلی سے دہشتناک چیخ کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی نکلی اور کوئی بچاؤ کے لئے زور زور سے گلا پھاڑے ہیبت سے چلانے لگا۔

منجریکر نے مستعدی سے جیب کو روک لیا اور جیپ سے چھلانگ لگا کر دوڑتا ہوا اُس گلی میں

گھسا تب تک اس آدمی نے، جس نے چیخ ماری تھی، اس کی انتڑیاں باہر آ گئی تھیں۔ وہ دم توڑ چکا تھا اور جس نے چاقو سے اُس کا پیٹ چاک کیا تھا۔ وہ چاقو ہاتھ میں پکڑے منجر یکر کے سامنے کھڑا حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

منجر یکر نے فوراً اُسے پہچان لیا --- یہ وہی مجرم تھا، جس کو اس نے پہلے قتل کی ایک واردات میں فسادات کے موقع پر عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ لیکن سیاہی مداخلت اندازی کے سبب وہ نہ صرف عدالت سے بُری ہو گیا تھا بلکہ اُس نے محلے بھر میں مٹھائی بھی بانٹی تھی......

منجر یکر کو یہ سب یاد آتے ہی اُس نے نفرت سے پستول کو اپنے ہولسٹر سے کھینچ لیا۔ اور غصہ سے پھنکار کر کہا۔

''اس بار تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے مسٹر......'' وہ گرجا ''دیکھتا ہوں، اس بار تمہیں کون چھڑاتا ہے؟ میں نے آج تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔

مجرم نے بھی منجر یکر کو پہچان لیا تھا۔ وہ انسپکٹر کی وردی کی طرف دیکھتے ہوئے قہقہہ لگانے لگا۔ اور چاقو بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے بولا۔

''اچھا چلو انسپکٹر! آج اپنا یہ ارمان بھی پورا کر لو...... مجھے ہتھکڑی لگا دو اور کھڑا کر دو، مجھے پہلے کی طرح عدالت کے کٹہرے میں......''

منجر یکر، جو مجرم کو اس دیدہ دلیری پر جھلا گیا تھا، اس نے ایک زبردست گھونسہ اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ اور پھر اُسے دھکیلتے ہوئے اپنی جیپ کی طرف لے آیا اور ریوالور اس کی پشت پر رکھتے ہوئے اس کو حکم دیا۔

''بیٹھ جاؤ جیپ میں۔ اب میں تمہیں کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا''۔

مجرم چوں چرا کئے بغیر اطمینان سے جیپ میں بیٹھ گیا اور انسپکٹر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ''اور کوئی حکم......''

''حکم کے بچے......'' منجر یکر گرجا۔ ''چپ چاپ جیپ میں بیٹھے رہو۔'' پھر وہ پستول کو تولتے ہوئے کاٹ کھانے والی آواز میں بولا ''اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو......''

''نہ......نہ......نہ......'' مجرم نے درمیان میں ہی انسپکٹر کی بات کاٹ دی۔ اور اپنے دونوں کانوں کی لوؤں کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے بولا ''کون بے وقوف اس قسم کی حرکت کر سکے گا۔ انسپکٹر! جب کہ پستول اس کے سینے کی طرف لگا ہو۔ اور وہ پستول ایک پولیس آفیسر کے ہاتھ میں دبا ہو۔ جو......''

''بس......بس......!'' منجر یکر نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی اور اس کو سامنے بازو والی سیٹ

پر دھکیل کر خود سٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی طرف گھورتے ہوئے تیزی سے جیپ آگے بڑھا دی۔

جیپ تھوڑی دور ہی چلی تھی کہ مجرم نے جھلا کر پولیس والوں کو ایک گندی گالی دی اور نفرت سے بولا:

''اب تم مجھے تھانے لے جاؤ گے' اور پھر مجھ پر غصہ اُتارو گے' مجھے مارو گے توڑو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں میرا کوئی ہاتھ یا پیر ٹوٹ جائے۔ لیکن اس سے پہلے ہی میں تمہیں بتلا دوں کہ تھانے میں اس تعلق سے تمہیں فون آئے گا کہ میرے ساتھ جبر و تشدد نہ کیا جائے کیونکہ میں واردات کرنے کے بعد ٹھکانے نہ پہنچوں گا تو جلدی ہی شہر کے ہر پولیس اسٹیشن کا فون بج اُٹھے گا......''

منجریکر نے غصے سے مجرم کی طرف دیکھا اور جیپ کی رفتار مزید تیز کر دی۔ کیونکہ اسے تھانہ جلدی پہنچ کر جوانوں کو جائے واردات پر بھیجنا تھا مزید کارروائی کیلئے۔

تھانے پہنچتے ہی منجریکر نے' دو جوانوں کو جو مختلف مقامات پر متعین کرنے کے بعد تھانے میں بچے رہ گئے تھے ہدایت دے کر واردات کے مقام کی طرف روانہ کر دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے حوالات کھول کر مجرم کو اندر دھکیل دیا......شاید اس نے حوالات کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی......تبھی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

مجرم' جو انسپکٹر کے دھکیلنے پر لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ فوراً انسپکٹر کی طرف مڑا اور مضحکہ خیز انداز میں مسکرایا۔

''دیکھو انسپکٹر! کہیں یہ فون......جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ میرے تعلق سے ہی نہ ہو......!

منجریکر نے رُک کر تیز نگاہوں سے مجرم کی طرف دیکھا......اس کی شعلہ بار آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''دیر نہ کرو انسپکٹر! جلدی سے فون اُٹھاؤ--!'' مجرم نے انسپکٹر کو اس طرح رُکتے دیکھ کر تیزی دکھائی۔

لیکن منجریکر کے کان پر جوں تک نہ رینگی......وہ لاپرواہی سے فون کی طرف دیکھنے لگا......

مجرم غصہ سے بھر اُٹھا اور حوالات سے نکل کر فون کی طرف بڑھنے لگا کہ کہ منجریکر نے آگے بڑھ کر بیچ میں ہی اُسے روک دیا۔

مجرم کے منہ سے ایک گندی گالی نکل گئی۔ وہ طیش میں منجریکر پر جھپٹ پڑا اور آناً فاناً میں اس کے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا اور پھر اُسے گولی کا نشانہ بنانے لگا کہ منجریکر نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے فوراً اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور اُچک لیا اور دانت پیستے ہوئے ریوالور کو مجرم پر تان کر گرجا۔ ''ہینڈز اپ۔''

تب ہی فون کی گھنٹی جو دیر سے بج رہی تھی۔ یکدم رُک گئی۔ اور پھر اسی وقت انسپکٹر کے پستول کی نال

سے گونج کے ساتھ ایک شعلہ لپکا۔ جس سے تھانے کے درودیوار جھنجھنا اُٹھے۔ ساتھ ہی زناٹے کے ساتھ ایک گولی مجرم کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ وہ فرش پر گرا اور دہشت سے انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے سینے سے خون بلبلوں کی طرح اُبل رہا تھا۔

تب ہی فون کی گھنٹی، جو رک گئی تھی۔ دوبارہ بجنے لگی۔

منجریکر نے جھپٹ کر اپنا ہاتھ فون پر رکھ دیا...... وہ چاہتا تھا کہ کال کو ڈسکنٹ کردے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اُس نے ریسور کریڈل سے اُٹھا لیا۔

ادھر سے ایک بھاری آواز آئی اور مجرم کے بارے میں دریافت کیا جانے لگا۔

منجریکر کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ پریشانی کے عالم میں وہ کرسی کھینچ کر ٹیبل کے سامنے بیٹھ گیا اور خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ہاں--ہاں!! سر لیکن لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اُس مجرم کو موقع واردات سے لاکر حوالات میں بند کر رہا تھا کہ اس نے پلٹ کر مجھ پر حملہ کردیا اور میرے ہولسٹر سے اس نے ریوالور نکال لیا اور مجھے گولی کا نشانہ بنا رکھا تھا کہ میں پستول حاصل کرنے کے لئے اس پر جھپٹ پڑا لیکن اس کھینچا تانی میں پستول سے گولی چل گئی اور وہ...... وہ مر گیا'' کہتے ہوئے منجریکر نے لاش کی طرف دیکھتے ہوئے فون پر مزید کچھ کہے سنے بغیر اس کو ڈسکنیکٹ کردیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے سوچ میں غرق ہوگیا۔

اس واقعہ نے منجریکر کے دل و دماغ کو بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا...... وہ سوچ رہا تھا...... مداخلت کے سبب مجرم کتنے دلیر ہو چکے ہیں کہ لا اینڈ آرڈر ان کے نزدیک ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے اور اُن کے ہاتھ اتنے لمبے ہو چکے ہیں کہ قانون کی میزان بھی اُن کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ ایسے میں پولیس اپنے ہاتھ پیر یا جان بچا سکے۔ یہی غنیمت ہے۔

چنانچہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے باوجود بھی منجریکر کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ آج کے اس سنگین واقعے نے اس کی آنکھیں پوری طرح کھول دی تھیں اور وہ اپنے آپ کو ایک حقیر رینگتا ہوا کیڑا تصور کرنے لگا تھا۔ جس کو مسلنے کے لئے کوئی دیر نہیں لگتی۔

دوسرے لمحے منجریکر نے مایوسی سے ریوالور کو میز پر رکھ دیا اور سامنے رکھے رائٹنگ پیڈ کو اپنے آگے کھینچ کر اس پر اپنا استعفیٰ لکھنے لگا---؟

استعفیٰ کو مکمل کرنے کے بعد مزید کارروائی کے لئے وہ تھانے سے باہر نکل آیا۔ اور جوانوں کا انتظار کرنے لگا---؟

پولیس کانسٹبلری

> پولیس کا کام عوام کی حفاظت کرنا ہے۔ یہ تاثر عوام کے دلوں سے کبھی اُٹھ بھی جاتا ہے جب پی۔ اے۔ سی جیسی پولیس کانٹبلری جنم لیتی ہے شیطان کی کوکھ سے---

ونگ کمانڈر کواس کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی کہ ان حالات میں جب کہ جگہ جگہ فسادات بپا ہیں' اس کی کانسٹبلری کے بیشتر جوان چھٹیوں کے لئے درخواستس اپنے اپنے متعلقہ صیغوں میں دے چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی چھٹیاں منظور کرلی جائیں تاکہ وہ جلد سے جلد اپنے گھروں کو لوٹ سکیں جہاں ان کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن ونگ کمانڈر کو اوپر سے ہدایات ملی تھیں کہ جوانوں کو فوراً ان علاقوں کی طرف روانہ کردیا جائے جو گڑبڑ زدہ علاقے قرار دے دیئے گئے ہیں۔ اور انہیں وہاں کا چارج سونپ دیا جائے۔

چارج سونپنے کا مطلب ونگ کمانڈر خوب جانتا تھا کہ وہ ایک پولیس ایکشن ہوگا نہتے عوام کے خلاف اس لئے وہ مجبور تھا کہ کسی بھی جوان کی چھٹی کو منظور کرے۔ اگر چہ وہ یہ بات بھی خوب جانتا تھا کہ ان میں سے بعض کی چھٹیاں منظور نہ کی جائیں تو گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔

لیکن ونگ کمانڈر مجبور تھا اور وہ یہی بات جوانوں کو بتلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے سامنے گڑبڑ زدہ علاقوں کا چارج سونپنے سے پہلے نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں اپنی بات شروع کی۔

"دیکھو جوانو! مجھے معلوم ہے کہ تمہیں چھٹیوں کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ اور اپنے اپنے گھروں کو پہنچنے کی کتنی جلدی ہے کیا کریں کہ گروہ واری جھڑپوں میں گڑبڑ زدہ علاقے ہیں کہ بڑھتے ہی چلے جارہے ہیں۔ اس لئے میں مجبور ہوں کہ تم میں سے کسی کی بھی چھٹی منظور کروں۔ جن میں کوئی اپنی شادی کے لئے کوئی اپنی بہن کی شادی کے لئے کوئی بھائی کی اور کوئی اپنے بوڑھے باپ کو دیکھنے کی تمنا لئے جو موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ہے جانا چاہتا ہے" کہتے ہوئے ونگ کمانڈر ایک لمحے کے لئے رُکا--- پھر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا"۔ مجھے اوپر سے ہدایات ملی ہیں کہ میں تم لوگوں کو گڑبڑ زدہ علاقوں کا چارج سونپ دوں۔ اس کا مطلب تم بہتر طور پر جانتے ہو کہ تمہیں وہاں کیا کرنا ہے"۔

یہ سنتے ہی جوانوں کی صفوں میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ ابھی کلثوم پورہ اور میوات کی پولیس

کارروائیوں کو بھولے نہیں تھے کہ وہاں انہوں نے کتنے ہی گھروں کے دروازوں کو توڑ کر اندر گھس گئے تھے اور کئی نو جوان عورتس اور مردوں کے سینوں میں مشین گنوں کے دہانوں سے آگ اگلتی گولیاں جھونک دی تھیں۔اور کتنے ہی معصوم روتے بلکتے بچوں کے سینوں میں سنگین گھونپ دی تھیں بعض فوجیوں نے تو کرتب بازی کے جوہر دکھاتے ہوئے دودھ پیتے بچوں کو اُچھال اُچھال کر ان سنگینوں پر اس طرح اٹھائے رکھا تھا کہ یہ سنگیں بچوں کے پیٹیوں میں پیوست ہو کر پیٹھ میں سے باہر نکل آئیں تھیں---پھر وہاں سے ان تمام لاشوں کو بے دردی سے ٹرکوں میں بھر کر تالابوں' کنوؤں اور ندی نالوں میں ڈال آئے تھے تو وہ کئی دنوں تک اپنے ہوش میں نہیں رہے تھے۔

لیکن اس وقت زیادہ تر جوان چھٹیوں پر اپنے گھروں کو جانے کے لئے بے چین تھے کہ مسلسل کئی سالوں سے وہ اپنے گھروں سے بچھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ کمانڈر کی طرف سے دیئے گئے اس حکم کو انہوں نے بے دلی سے سنا اور بجھے دل سے خاموش ہو گئے۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کو کہ وہ پہلے اپنے گھروں کو جانا چاہتے ہیں کمانڈر پر ظاہر نہ کر سکے۔

اس پر کمانڈر نے فخر سے طائرانہ نظریں اپنی کانسٹبلری پر دوڑائیں اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا:

''مجھے خوشی ہو رہی ہے جوانو! اس بات کی کہ تم میں سے ہر ایک نے پہلے اپنی ڈیوٹی کو مقدم سمجھا''

''ہاں سر!'' ایک جوان جھٹ اپنے جیب سے ایک پوسٹ کارڈ نکالتے ہوئے جس میں اُس کے ماں اور باپ دونوں کے گزر جانے کی اطلاع تھی صف میں سے آگے نکل آیا اور پوسٹ کارڈ کو کمانڈر کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے اُس کو زمین پر ٹپک دیا اور بولا اب مجھے رخصت کی ضرورت نہیں ہے۔ سر چونکہ میری ماں اور باپ دونوں ہی مر چکے ہیں۔ اب میں اپنی ڈیوٹی اتنی ہی خوش اسلوبی سے نبھاؤں گا جس کی مجھے ہدایت دی گئی ہے'' کہتے ہوئے جوان نے کھٹ سے اپنے بوٹ بجاتے کمانڈر کو سیلوٹ کیا اور ایک دو قدم پیچھے ہٹ کر ساری کی ساری میگزین کمانڈر کے سینے میں جھونک دی۔

کمانڈر دہشت سے آنکھیں پھاڑے کھڑا اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ ایک کٹے درخت کی طرح زمین پر گرا تو وہ بُری طرح ڈکرا رہا تھا۔

اس اچانک کارروائی سے جوانوں کی صفوں میں کھلبلی کی ایک لہر دوڑ گئی وہ سب سکتے کے عالم میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

جوان جس کے ہاتھ میں ابھی بھی رائفل تھمی ہوئی تھی نیچے کمانڈر کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے جو نزع کے عالم میں خرخرا رہا تھا۔ سختی کے ساتھ اپنے دانت بھینچ لئے اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''مجھے معاف کرنا سر، میں نے کوئی غلطی نہیں کی گولی چلا کر' کیونکہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ نہتے عوام پر گولی چلا کر جس کا حکم ایک کمانڈر نے دیا تھا' اس پر گولی چلانے میں کیا فرق ہوتا ہے......'' پھر وہ ایک لمحہ رُک کر اپنی رائفل کو مضبوطی سے تھامے مستحکم لہجے میں بولا ''اب مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ مجھے اس کی کیا سزا ملتی ہے۔ ہوسکتا ہے مجھے بھی گولی سے اُڑ دیا جائے لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ کیونکہ میری ماں اور میرا باپ دونوں ہی مر چکے ہیں' اس وقت جب میں پولیس کارروائی میں مصروف تھا۔ اور کلثوم پورہ اور میوات میں نہتے عوام کے سینوں میں گولیاں داغتا پھر رہا تھا۔ اس وقت مجھے کوئی احساس نہیں تھا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ لیکن آج...... آج میری ماں اور میرا باپ دونوں ہی میرا انتظار دیکھتے دیکھتے بیماری کی حالت میں ہی مر چکے ہیں تو مجھے شدت کے ساتھ اس کا احساس ہو رہا ہے کہ وہ بھی کسی کے باپ تھے' جن کے سینوں میں' میں نے گولیاں جھونک دی تھیں' عورتیں کسی کی ماں تھیں جن بھاری چھاتیوں کو میں نے کاٹ ڈالا تھا اور پھر دودھ پیتے بچوں کے سینوں میں سنگینیں گھونپ دی تھیں۔ کہتے ہوئے جوان نے نفرت سے رائفل کو زمین پر ٹپک دیا اور نیچے بیٹھ کر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے سسکتے ہوئے رونے لگا۔

کانسٹبلری کے تمام جوان جو سکتے کے عالم میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے ہوش میں آ گئے اور انہوں نے اپنی اپنی رائفلوں کو زمین پر رکھ دیا۔ پھر وہ سب جوان اور ونگ کمانڈر کی لاش کے اطراف ایک دائرے کی شکل میں پھیل کر آہستہ آہستہ اس دائرے کو تنگ کرنے لگے......

دوسرے دن ونگ کمانڈر جس نے نیا نیا چارج سنبھالا تھا اپنی کانسٹبلری کے سامنے فائرنگ اسکواڈ کو حکم دیا -- فائرنگ اسکواڈ نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر ایک ساتھ کئی گولیاں اُس قاتل جوان کے سینے میں جھونک دیں جو دیوار سے لگا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو اُوپر اٹھائے کھڑا تھا۔ پھر جوان کے حشر سے بے پرواونگ کمانڈ نے درشت لہجے میں اپنی کانسٹبلری کو مخاطب کیا۔

''تم میں سے کوئی بھی جوان جو چھٹیوں پر جانا چاہتا ہے وہ میرے سامنے آجائے''۔

تقریباً کانسٹبلری کے آدھے جوان صفوں میں سے آگے نکل آئے اور ونگ کمانڈر کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

ونگ کمانڈر کے چہرے پر فوراً ناگواری کے اثرات آ گئے۔ اُس نے غصے سے اپنے ایک پیر کو زور سے زمین پر ٹپکا اور پلٹ کر اُس جوان کی طرف دیکھتے ہوئے جو فائرنگ اسکواڈ کی گولیوں سے چھلنی ہو کر مردہ پڑا تھا حکم دیا۔

''جو جوان ابھی ابھی اپنی صفوں میں سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں وہ چھٹیوں پر

چلے جائیں۔ ان کی چھٹیاں منظور کر دی جائیں گے اور بقیہ جوان حصہ فائرنگ اسکواڈ کے اپنی اپنی بیرکوں کی طرف چلے جائیں اور میدان خالی کر دیں اور...... وہ جوان بھی، جو چھٹیوں پر جانا چاہتے ہیں۔ ونگ کمانڈر نے ایک لمحہ رُک کر ذرا مختلف لہجہ میں آخری جملہ ادا کیا اور پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔

کانسٹبلری کے سبھی جوان آہستہ آہستہ مارچ پاس کرتے ہوئے اپنی اپنی بیرکوں کی طرف جانے لگے۔

جب میدان خالی ہو گیا اور ایک بھی جوان میدان میں نہ رہا تو ونگ کمانڈر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس نوجوان کی لاش کے قریب آیا۔ اور اُس نے لاش کے سر پر رکھی ٹوپی اُس کے سر سے اُتار لی اور لاش کا چہرہ اس ٹوپی سے ڈھکتے ہوئے جس کی آنکھیں خوف سے پھٹی پھٹی اس کی طرف ہی جمی ہوئی تھیں، دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنے سر سے فلیٹ اتاری اور سر جھکائے لاش کے آگے کچھ لمحوں تک خاموش کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے سر پر فلیٹ رکھے تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا اپنے ٹینٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

سوکھا ملک کے بیشتر علاقوں کا مقدر ہے۔ ہر سال کہیں نہ کہیں سوکھا پڑتا رہتا ہے۔ اور جو سوکھے سے جوجتے ہیں وہ اکثر غریب کسان ہی رہتے ہیں اور اناج پیدا کرتے رہتے ہیں ملک کے لئے اور خود بھوکے رہتے ہیں ان حالات میں---

اس سال زبردست سوکھا پڑا۔ کنوئیں اور تالاب سوکھ گئے' کھیت سوکھ گئے' زمین تڑخ گئی---ایسے میں جانور تو بھوکے مر ہی رہے تھے لوگ بھی اس زبردست کال کی زد میں آ گئے اور بھوک سے بلبلا کر جس کے سینگ جدھر سمائے ادھر بھاگ نکلے حتی کہ گاؤں کے گاؤں خالی ہونے لگے۔

ستر سالہ بینی مرپا معمولی سا کسان تھا اس کے پاس تھوڑی سی زمین جانوروں کی ایک جوڑی اور ہل تھا وہ اپنی نوجوان بہن پرکا کے ساتھ اپنی زندگی کے بقایہ دن بڑی کڑی محنت کر کے بسر کر رہا تھا۔ کال نے تو اسے اور ہی مار ڈالا۔

چاہتا تو وہ بھی اوروں کی طرح گاؤں سے بھاگ جاتا لیکن وہ اس اطمینان پر کہ آج نہیں تو کل بھگوان کی کرپا ہوگی اور دھرتی پھر سے لہلہائے گی گاؤں میں ہی ٹھہرا رہا۔

کھیت میں کال کے کارن کوئی کام نہیں رہا تھا پھر بھی وہ حسب معمول روز تڑکے اٹھتا اور اپنی بہن پرکا کے پیر پڑ کر کھیت جاتے ہوئے اپنے ان جانوروں کی بھی پوجا کرتا جس کو گاؤں کی ایک رحم دل خاتون کرائنگماں نے انہیں زندہ رہنے کے لئے تحفتاً دیا تھا۔

صبح صبح مرپا ایک دن روز کی طرح اٹھا تو دیکھا پرکا اس کے بازو نہیں۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اٹھے اور پرکا بازو نہ ملے یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

اگرچہ سوکھے کے کارن لوگ بھاگ بھاگ کر گاؤں چھوڑ رہے تھے اور وارداتیں بھی ایسی ہو رہی تھیں جو اتنی شرمناک تھیں جن میں عزتوں کا نیلام عام بات تھی اور جانوروں کے ساتھ ساتھ سامان کی چوری بھلا کس شمار میں کیونکہ---مرپا نے دیکھا تھا کہ کھلان میں جانوروں کا بھی پتہ نہیں۔

اس نے سوچا تھا کہ مرپا شائد کھلیان میں ہوگی جانوروں کے ساتھ' لیکن یہاں پرکا اور جانوروں کو نہ

پا کراس کے جسم سے رہی سہی قوت بھی ٹوٹ گئی اور وہ چکرا کر وہیں دھپ سے گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

کتنی ہی دیر تک وہ وہیں بے ہوش پڑا رہا۔

آہستہ آہستہ ہوش میں آتے ہوئے جو پہلی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی وہ پرکا کی تھی۔

مرپا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں تو حیرت زدہ رہ گیا۔

اس نے دیکھا تھا کہ پرکا ایک ہاتھ میں تھال پکڑے اسے ڈھانپے دوسرے ہاتھ سے اپنے سر ور سینے کو دبائے ایسے ہی ٹوٹی پھوٹی کھڑی ہے جیسے چڑھتی ندی کے کنارے پر باندھا ہوا باندھ پانی کے تھپیڑوں سے کبھی کا ٹوٹ چکا ہے۔

پرکا کو اس حال میں دیکھ کر مرپا کے منہ سے ڈوبتی اُبھرتی ایک روہانسی سی آواز نکلی اور وہ آنکھیں نیچی کئے ہی کسی ایک انجانے خوف سے بڑبڑا اٹھا۔

''معلوم نہیں تو کہاں چلی گئی تھی''۔ پرکا کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا اور اس کی آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے لرزنے لگے۔

اس نے جھک کر پہلے تھال نیچے رکھ دیا پھر--- اپنے کمزور ہاتھوں سے تھال پر سے کپڑا کھینچ لیا۔

مرپا یکدم پیچھے ہٹا اور کھلی کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ تو نے کیا کیا---'' وہ کانپ اٹھا۔

''وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا مرپا''۔ اس نے کمزور آواز میں آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''میں تجھے فاقوں مرتے نہیں دیکھ سکتی اس لئے میں نے جانوروں کو کٹوا ڈالا ہے یہ ان کا گوشت ہے تو کھا میں تجھے مرتے نہیں دیکھ سکتی''۔

مرپا کے جسم سے جیسے سارا خون نکل گیا بھوک سے تو وہ پہلے ہی مر رہا تھا اب تو جسم سے جیسے رہی سہی طاقت بھی نکل گئی۔

وہ دیوار کا سہارا لئے بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کئے رونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا پرکا اپنے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے گوشت کو سکھانے رسی پر ڈال رہی ہے۔

مرپا دل ہی دل میں روتے ہوئے بھگوان سے معافی مانگنے لگا۔ اور اسے گوشت کھاتے ہوئے ایسے ہی محسوس ہونے لگا جیسے وہ خود اپنا گوشت کھا رہا ہے۔

پا کراس کے جسم سے رہی سہی قوت بھی ٹوٹ گئی اور وہ چکرا کر وہیں دھپ سے گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

کتنی ہی دیر تک وہ وہیں بے ہوش پڑا رہا۔

آہستہ آہستہ ہوش میں آتے ہوئے جو پہلی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی وہ پر کا کی تھی۔

مرپا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں تو حیرت زدہ رہ گیا۔

اس نے دیکھا تھا کہ پر کا ایک ہاتھ میں تھال پکڑے اسے ڈھانپے دوسرے ہاتھ سے اپنے سرور سینے کو دبائے ایسے ہی ٹوٹی پھوٹی کھڑی ہے جیسے چڑھتی ندی کے کنارے پر باندھا ہوا باندھ پانی کے تھپیڑوں سے کبھی کا ٹوٹ چکا ہے۔

پر کا کو اس حال میں دیکھ کر مرپا کے منہ سے ڈوبتی اُبھرتی ایک روہانسی سی آواز نکلی اور وہ آنکھیں نیچی کیے ہی کسی ایک انجانے خوف سے بڑبڑا اٹھا۔

''معلوم نہیں تو کہاں چلی گئی تھی''۔ پر کا کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا اور اس کی آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے لرزنے لگے۔

اس نے جھک کر پہلے تھال نیچے رکھ دیا پھر---اپنے کمزور ہاتھوں سے تھال پر سے کپڑا کھینچ لیا۔

مرپا یکدم پیچھے ہٹا اور کھلی کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ تو نے کیا کیا---'' وہ کانپ اٹھا۔

''وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا مرپا''۔ اس نے کمزور آواز میں آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''میں تجھے فاقوں مرتے نہیں دیکھ سکتی اس لئے میں نے جانوروں کو کٹوا ڈالا ہے یہ ان کا گوشت ہے تو کھا میں تجھے مرتے نہیں دیکھ سکتی''۔

مرپا کے جسم سے جیسے سارا خون نکل گیا بھوک سے تو وہ پہلے ہی مر رہا تھا اب تو جسم سے جیسے رہی سہی طاقت بھی نکل گئی۔

وہ دیوار کا سہارا لئے بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کیے رونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا پر کا اپنے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے گوشت کو سکھانے رسی پر ڈال رہی ہے۔

مرپا دل ہی دل میں روتے ہوئے بھگوان سے معافی مانگنے لگا۔ اور اسے گوشت کھاتے ہوئے ایسے ہی محسوس ہونے لگا جیسے وہ خود اپنا گوشت کھا رہا ہے۔

''ہاں...... نہیں۔ نہیں...... غلط۔ میں نے صرف اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کیا'' زخمی نے بہ دقت تمام تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔

''اس کو چھوڑو --- جمعدار اپنی موچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا --- ''پہلے یہ بتلاؤ کہ تمہارے خلاف فلاں دفعہ کے تحت تم پر فرد جرم کیوں نہ عائد کر دیا جائے کہ تم نے اوروں کے خلاف اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا''۔

یہ کیا بکواس ہے! زخمی جو زخموں سے چور چور تھا تنک کر بولا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے''۔

-''یہ سب سمجھ میں آجائے گا آہستہ آہستہ سب سمجھ میں آجائے گا۔'' جمعدار بدستور اپنی موچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بولا --- ''اس وقت سب سمجھ میں آجائے گا جب میں تمہیں حوالات میں بند کر دوں گا''۔

تھانے کے باہر بھی ٹھہرے رہتے ہیں ہم یہ کیسے سمجھ لیں گے کہ وہ تمہیں مارنے ہی کے لئے ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' جمعدار نے میخ نکالی۔

''تو آؤ دیکھو'! زخمی تقریباً روہانسی آواز میں بولا --- ''دیکھو وہ مجھے مارتے ہیں کہ نہیں اُٹھو۔ میں ابھی باہر نکل رہا ہوں۔''

''اچھا چلو --- جمعدار بھی بغل میں ڈنڈا دبائے زخمی کے پیچھے پیچھے تھانے سے باہر نکلا۔

باہر وہ چاروں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور زخمی کو جمعدار کے ساتھ تھانے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر وہ فوراً پیچھے ہٹے...... پھر زخمی جب تھانے کی سیڑھیاں اترتا ہوا ان کے قریب پہنچا تو ان چاروں نے مل کر اسے پکڑ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب اس کی تکا بوٹی کر ڈالے۔

یہ دیکھ کر جمعدار فوراً گھبراہٹ میں اپنی پیٹھ پلٹائے اسی وقت بغل میں ڈنڈا دبائے ایک ہاتھ میں اپنا ڈھیلا ڈھالا خاکی نیکر اوپر چڑھاتا ہوا جو اس کی توند پر سے بڑی حد تک نیچے پھسل آیا تھا۔ سنبھالتا ہوا تھانے کے اندر چلا گیا۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے سامنے پڑے ٹیبل پر ایک غیر ضروری رجسٹر کو کھول کر اس پر جھک پڑا اور آہستہ آہستہ اپنے آپ بڑبڑانے لگا۔

''مر گیا سالا --- حوالات سے ڈر گیا تھا۔ حوالات میں بند ہو جاتا تو بچ نہ جاتا۔ جانے کیوں لوگ حوالات سے اتنا ڈرتے ہیں''۔

سوچ سکو تو سوچو!

......جس طرح سکے کے دو رُخ ہوتے ہیں چت وپٹ' اس طرح زبان کے بھی دو رُخ ہوتے ہیں ہاں' یا ناں! ہٹ دھرمی کے کوئی رُخ نہیں' بلکہ چت بھی اپنا پٹ بھی اپنا تو ایسی ہٹ دھرمی مطلبی ہوتی ہے سچائی پر مبنی نہیں۔

وہ نیم پاگل مشہور تھا' تاہم ایک فلسفی کی طرح لگتا تھا۔ بعض اوقات وہ پاگل پن میں بھی ایسی عقل مندی کی بات کر جاتا کہ ہوش مندوں کے ہوش اُڑ جاتے اور وہ سوچنے لگ جاتے کہ معلوم نہیں ہم پاگل ہیں یا وہ پاگل۔ چنانچہ وہ پاگل پن میں بھی کسی بھی مسئلہ پر جو بظاہر گنجلک ہوتے ایسے پتے کی بات کہہ جاتا فلسفیانہ ڈھنگ سے کہ لوگ سچائی سے خوفزدہ بغلیں جھانکنے لگتے یا پھر ڈر کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

چنانچہ مندر مسئلہ پر جب کہ یہ مسئلہ عدالت میں زیرِ دوراں تھا' تا حال اس کا ابھی کوئی حل نکل نہ پایا تھا' مسجد کمیٹی نے مسئلہ کو عدالت کے فیصلہ پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ اس کے فیصلے کو مانیں گے۔ لیکن مندر کمیٹی عدالت کے فیصلہ کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ عدالت عقیدے کا حل کیسے نکال پائے گی۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ نیم پاگل اس کا فیصلہ دے۔ وہ اس کے فیصلے کو مانیں گے چاہیے کچھ ہو۔

نیم پاگل نے مسئلہ کو فلسفیانہ انداز میں سوچا اور عقل کی ترازو میں تولا پھر بولا'' دیکھو! جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ صحیح تھا اور اب جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ غلط ہے۔ عقیدہ عقل سے ہوتا ہے بے عقلی سے نہیں' نہ ہی یہ کہیں زور زبردستی سے ٹھونسا جاسکتا ہے اور نہ تھوپا جاسکتا ہے'' اتنا سننا تھا کہ وہ تمام جو اس تنازعہ کو لیکر اس کے پاس آئے تھے مسئلہ سلجھانے کی غرض سے' وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے کہ جانے نیم پاگل پھر ایسی ہی کوئی فلسفیانہ قسم کی بات اس مسئلہ پر فلسفیانہ انداز و ڈھنگ سے کہہ دے کہ وہ لاجواب ہو جائیں۔

دوسرے دن نیم پاگل نے ایک خواب دیکھا۔ بڑا اوندھا سیدھا خواب۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ چوپٹ راجہ نے اپنی گدی کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے منہدمہ مسجد کے اطراف کی غیر متنازعہ ساری زمین مندر کمیٹی کو سونپ دینے پر وہاں زمین جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ اور ساری عمارتیں آگ و شعلوں

کے بیچ گھری جلتی انگاروں کی طرح زمین میں دھنستی چلی جارہی ہیں۔لوگوں کی چیخ وپکار آہ وبکا کی آوازیں بھی ان زمین میں دھنستی ہوئی عمارتوں کے شور میں دبتی چلی جارہی ہیں ۔اس دہشت ناک نظارے سے پاگل گھبرا کر نیند سے جاگا تو وہاں کوئی نہیں تھا یہ پوچھنے کہ پاگل نے خواب میں کیا دیکھا۔

پھر کبھی کسی نے پاگل کو پاگل پن میں نہیں دیکھا۔اور نہ ہی کبھی کسی نے اس سے ہوشمندی میں کچھ پوچھنے کی جرأت کی ۔مطلب صاف ہے قرآن میں ایسے لوگوں پر کہ......کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ابر کے سائبانوں میں اللہ اور اس کے فرشتے اتر آئیں اور ان کا کام تمام کردیا جائے---جیسا کہ سائیکلون اس بات کی گواہی دیتے آرہے ہیں ۔جیسا کہ زلزلے زمین کے سینوں کو پھاڑ کر تباہی مچاتے آرہے ہیں اور آتش فشاں زمین کے منہ سے آگ اُگلتے رہتے ہیں بار بار کیا یہ سب خدائی غیض وغضب کے مظہر نہیں؟......سوچ سکو تو سوچو!

کباب میں ہڈی

کباب میں کبھی ہڈی نہیں ہوتی۔ ہاں کلیجی آجائے کبھی اور بات ہے۔ لیکن یہ کلیجی بھی نرم گوشت میں بری لگتی ہے رکاوٹ کے سبب ان ہی وقتوں کے لئے یہ محاورہ زدعام ہوگیا ہوگا۔ مثال کے طور پر کوئی He' She نرم نرم ہاتھ پکڑے میٹھی میٹھی باتوں میں مصروف ہوا چانک کوئی تیسرا آجائے تو He کو برا لگے گا۔ ایسے موقعوں پر ہی اس نے کہہ دیا ہوگا۔ لو آگیا کباب میں ہڈی۔ کیوں غلط تو نہیں---

ایک بلا جو موٹا تازہ اور بھدا تھا ایک بلی جو دبلی پتلی اور خوب صورت تھی۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھی تھی، اسے کھاجانے والی نظروں سے گھور رہا تھا---

اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک نر اور ناری جو مسہری پر دراز تھے۔ لحاف کے اندر بلے کے اس طرح گھورتے رہنے کے عمل کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت لطف لینے لگے جب بلا گھورتے رہنے کے سلسلے سے اکتا کر آخر اپنی جگہ چھوڑ کر اُٹھا اور پہلے اپنے پچھلے حصے کو جلد جلد ہلاتے ہوئے دیوار پر ٹھہر ٹھہر کر پچکاری سی دھار ماری۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا بلی کے قریب گیا اور اس کے اطراف گھوم پھر کر اس کے سونگھے جانے والے حصوں کو تھوڑی دیر تک سونگھتا رہا۔ اور اس جگہ کو بھی جہاں بلی بیٹھی تھی پھر فوراً بلی کے اوپر جھک پڑا اور اس کی گردن پر کے نرم نرم بالوں والے گوشت کے لوتھڑے کو اپنے دانتوں تلے دبا کر پکڑ لیا۔ اور اپنی اگلی دونوں ٹانگوں کو بھی بلی کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ بلی پھر بھی خاموش بیٹھی رہی اس کی طرف سے ناگواری کا کوئی اظہار نہ ہوا تو بلے کا حوصلہ کچھ اور بڑھا اور وہ بلی کے پیچھے اپنی دونوں پچھلی ٹانگوں کو لے جا کر بلی کے پچھلے حصے کو اپنی پچھلی ٹانگوں کے بیچ کس لیا اور کپکپاتے اُٹھتے بیٹھتے اپنے پچھلے حصے سے ادھر دبانے لگا جدھر بلی کی دم تھی---

لیکن بلے کی تمام کوششوں کے باوجود بھی بلی ٹس سے مس نہیں ہوئی بلکہ اسی طرح بیٹھی رہی تو بلا جو جنسی ہیجان کا شکار ہو چکا تھا۔ ناچار بلی کے اوپر سے اتر گیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس دوران نر جو ناری کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ لحاف کے اندر ہی مستحکم لہجہ میں بولا۔ میں تو بلے

کی طرح ٹالونگا نہیں قلعہ کو سر کر کے رہوں گا۔

ناری جھلا اُٹھی لیکن تم کو قلعہ سر کرنے سے پہلے وہاں کی جگہ سونگھنی پڑے گی بلے کی طرح---

ٹھیک ہے ---نر نے بیل کی طرح اپنا سر ہلایا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے ناری پر پل پڑا تو ناری ارے--- ارے کہتی ہوئی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور فوراً مسہری چھوڑ کر نیچے اتر آئی اور بولی ''میرا مطلب کہنے کا یہ جگہ نہیں ایڈیٹ وہ جگہ ہے جہاں سے ابھی ابھی میں اٹھی ہوں'' وہ جگہ!! نر کو بڑا تعجب ہوا۔ اور اس نے فوراً اس جگہ سے لحاف کو اِلٹ دیا---

وہ جگہ جہاں سے ناری ابھی اٹھی تھی وہاں نر کو لٹھے کی سفید چادر پر ایک چھوٹا سا تکون' سرخ چمکیلا دھبہ دکھائی دیا جو ہاتھ لگانے پر چپچپا اور گیلا تھا۔

اس پر نر کا مزہ یکدم کرکرا ہو گیا اس طرح جیسے وہ بڑے مزہ سے کباب کھا رہا تھا۔ کہ اس میں سے ہڈی نکل آئی اور وہ جھلا کر ناری کی طرف دیکھنے لگا۔ جو خود سیخ میں چڑھا کباب بننے سے پہلے ہی ہنتے ہوئے وہاں سے نو دو گیارہ ہو چکی تھی۔

سرکاری لیٹرین

انسانی ضرورتوں کیلئے سرِعام چھپانے کے لئے نہیں بلکہ دیکھانے کیلئے جو چھوٹے چھوٹے کمروں جیسی بے پردہ تعمیرات ہوتی ہیں وہ سرکاری لیٹرین ہیں۔ اور جو گھر سے باہر یا چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوں ان کیلئے بڑی سہولت کے آؤ جاؤ گھر اپنا ہے۔ کوٹھے بھی چونکہ اجازت یافتہ ہوتے ہیں اس لئے وہی مماثلت وسہولت ان میں بھی ہے۔

گڑبڑ زدہ علاقہ میں جیسے ہی دنگے کے ساتھ چوتھی بار کرفیو نافذ ہوا ایک شخص جو اسی علاقے کا رہنے والا تھا سینڈھی کمپاؤنڈ میں بیٹھا نشہ کر رہا تھا، کرفیو لگنے کی اطلاع سن کر فوراً گھبرایا ہوا اُٹھا اور بچتا بچاتا اپنے گھر جا رہا تھا کہ پولیس کے حفاظتی دستے پر نظر پڑتے ہی فوراً ایک گھر کا دروازہ ڈھکیل کر اندر گھس پڑا۔ دوسرا بھی وہیں سے اسی طرح بچتا اپنے گھر جا رہا تھا تو وہ بھی پولیس کی عقابی نظروں سے بچنے کی خاطر پہلے شخص کے پیچھے گھسا۔

اتفاق سے وہ دونوں جہاں پناہ کی غرض سے گھسے تھے وہ گھر ایک رنڈی کا کوٹھا تھا۔

فلائینگ اسکوائیڈ کے دستے میں سے ایک جوان نے جو انہیں اس گھر میں گھستے ہوئے دیکھ لیا تھا، فوراً ان کا پیچھا کرتا ہوا وہ بھی اس گھر میں گھسا اور ان دونوں کو وہیں پکڑ لیا۔ رنڈی کو بھی اس جرم میں گرفتار کر لیا کہ اس نے کرفیو میں خلاف ورزی کرنے والوں کو پناہ کیوں دی۔

رنڈی نے اسے لاکھ سمجھایا کہ اس نے انہیں پناہ نہیں دی بلکہ وہ خود ہی گھر میں گھس آئے ہیں لیکن جوان نے اس کی ایک نہ سنی اور ڈانٹ کر کہا ''چلو جو کچھ کہنا ہے تھانے میں چل کے کہنا یہاں نہیں''۔

تھانے میں انسپکٹر' جوان سے سارے حالات سننے کے بعد جو فرض شناسی میں یکتا تھا' دونوں شرابیوں کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے تیز لہجہ میں حکم دیا۔

''انہیں حوالات میں بند کر دو''۔

پھر وہ رنڈی کو دبانے کی نیت سے اس کی طرف پلٹ پڑا ''کیا تمہارے پاس جسم فروشی کا لائسنس

موجود ہے؟''

''ہاں ہے!'' رنڈی نے بھی دبے بغیر اسی لہجہ میں جواب دیا لیکن کرفیو میں تم ایسا نہیں کرسکتیں۔ سمجھے۔انسپکٹر طیش میں آ گیا۔''حضور! میں کب کررہی تھی ایسا---ان ہی سے پوچھ لیجئے' یہ خود ہی بتلادیں گے کہ وہ پولیس سے ڈر کر پناہ کی غرض سے میرے یہاں گھس آئے تھے---ان کی نیت صاف تھی''۔

''قانون' کو اِنیت سے کوئی مطلب نہیں۔تم نے کرفیو میں کوٹھے کا دروازہ کھلا رکھا اور لوگوں کو اندر بلایا---یہی تمہیں اندر کرنے کے لئے کافی ہے سمجھے۔

رنڈی پیچ وتاب کھاتے لاجواب ہوگئی---''جاؤ--'' انسپکٹر زور سے دھاڑا---اس بار چھوٹ دے رہا ہوں۔آئندہ خیال رہے''۔پھر اس نے جوان کو ہدایت دی کہ رنڈی کو اس کے مقام پر چھوڑ آئے---

جوان انسپکٹر کی ہدایت پر رنڈی کو لے کر اس کے مقام پر اس کو چھوڑ کر لوٹنے لگا تو یہ دکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہاں تو سبھی کوٹھوں کے دروازے کھلے ہیں اور لوگ ان میں اپنے اپنے تہہ بند سنبھالتے' چھپتے چھپاتے اس طرح آ اور جارہے ہیں جیسے وہ سرکاری لیٹرین میں فراغت سے پہلے اور فراغت کے بعد کرتے ہیں۔ یہ نظارہ ہی ایسا تھا کہ جوان کو بھی جو دن رات مسلسل کئی دنوں سے چل رہے کرفیو میں جب کہ وہ گھر والی کی قربت کیلئے ترس گیا تھا' سخت ضرورت محسوس ہوئی---چنانچہ وہ بھی اپنے ڈھیلے ڈھالے نیکر کے بٹن کھولتا اس دروازے میں گھس گیا جہاں وہ ابھی کچھ دیر پہلے انسپکٹر کی ہدایت پر رنڈی کو چھوڑ آیا تھا۔
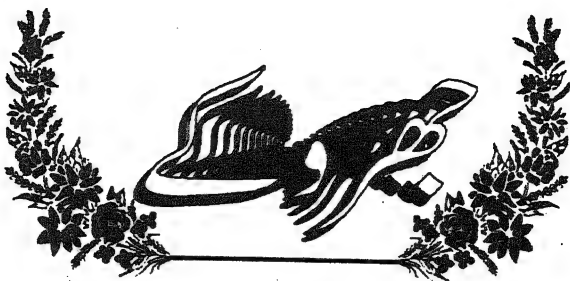
یہ جھروکے ''ہوا محل'' جے پور کے شاہی جھروکے نہیں ہیں جو شاہی رعب دبدبے جاہ وجلال کے مظہر رہے ہیں ۔ یہ جھروکے ہیں آئین کے' ایوانوں میں کھلتے جہاں کی گپت باتیں اور فیصلے عوام کے تئیں ذہنوں کو جھنجھوڑ دینے والے ہوتے ہیں ۔ یہ ہیں ماضی' حال' مستقبل میں گڈمڈ تاریخی پنے ہوا میں اُڑتے جھروکوں سے نکلتے کوئی پنا آپ کے بھی ہاتھ لگے تو اس کو بھی تاریخی اوراق میں جڑ دیجئے......

ان جھروکوں میں سے نکلتی ہوئی آوازوں کو جو اکثر اوقات ایوانوں کے شور وغل' دھنگا مشتی میں مچھلی مارکٹ کی سی فضاء بنائے رکھتی ہیں مطلب ومعنی برابر واضح نہیں رہتے جو کچھ لائیو ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے اس سے' صرف اخباری اطلاعات سے ہی کچھ پلے پڑتا ہے تاہم یہ جھروکے جس کو میں نے مختلف اوقات' مختلف مہینے ومختلف سالوں میں لکھا ہے' بہت کم ہیں لیکن معنی ومطالب میں بہت زیادہ ۔ تیرھواں جھروکہ حال ہی میں کھلا ہے جس میں سے اڈوانی جی کا چہرہ صاف اور واضح دیکھائی دے رہا ہے ۔ یہ فوٹو جینک نہ سہی ''پوٹو'' جینک تو ہے ۔

زہرہ مسحور

جھروکے

پہلا جھروکہ: یہ دنوں کی بات ہے جب پیاز کی حد درجہ گرانی نے جب کہ یہ سو روپے کیلو تک بکی تھی دلی اور مرکز کو رُلا رُلا ڈالا تھا عوامی غیظ و غضب نے اس سبب تو سب سے الگ تھلگ حیدر آباد میں چندرا بابو نائیڈو چیف منسٹر' شہر کو ہائی ٹیک سٹی بنانے میں جٹے ہوئے تھے۔ دیہاتوں میں مسئلہ کچھ اور ہی تھا یہ کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے سوائے غربت کے۔ چنانچہ ایک دیہاتی دوسرے دیہاتی سے جو کافی دنوں سے ہائی ٹیک سٹی کے بارے میں سنتا آ رہا تھا تجسس سے پوچھا:

''بھیا! آخر یہ ہائی ٹیک سٹی ہوتا کیا ہے؟''

دوسرا دیہاتی جیسے خود بھی اس بارے میں کوئی خاص شد بد نہیں تھی' صرف سن رکھا تھا' اندھیرے میں تیر مارا ''سنو وہ بولا' یہ ایک ایسا آلہ ہوتا ہے جس میں کئی بٹن لگے ہوتے ہیں اور ہر بٹن پر ایک نام ہوتا ہے بس جس نام کا بٹن دباؤ وہ کام ہو جاتا ہے''۔

''میں سمجھا نہیں ذرا کھول کر سمجھاؤ''

''ایسا سمجھو کہ پیاز نام کا لکھا بٹن دباؤ پیاز کا کام ہو جاتا ہے''۔

''یعنی پیاز نام کا بٹن دباؤ تو پیاز نکل آتی ہے۔ جیسے وزن بتلانے والے مشین پر کھڑے رہیں تو وزن کا کارڈ نکل آتا ہے۔''

''ارے نہیں! یہاں ایسا نہیں ہوتا''۔

''پھر کیا ہوتا ہے یہاں''۔

''یہاں صرف معلومات نکلتی ہیں۔'' وہ ہنسا۔ جیسے پیاز کا بٹن دباؤ تو معلومات نکلتی ہیں۔ گوداموں میں پڑے پڑے سڑ گئی۔ باہر سے درآمد شدہ پیاز جہازوں سے اتارنے تک سڑ گئی تو سمندروں میں پھینک دی گئی۔ آلو کا بٹن دباؤ تو معلوم ہوتا ہے گوداموں میں سے لوٹ لیئے گئے یا چوری ہو گئے۔ بیگن کا بٹن دباؤ تو معلوم ہوتا ہے بیگن کا بھرتہ پیٹ کے لئے خراب ہوتا ہے موشن آتے ہیں وغیرہ۔

''ارے واہ! یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ کاش! اس میں سے معلومات کے علاوہ چیزیں بھی نکلتیں'' پھر وہ کچھ سوچتے سر کھجاتے بولا۔

''اور اس میں ایک بٹن کپڑوں کا بھی ہوتا تو اچھا ہوتا۔ میری دھوتی جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے''۔

دوسرا دیہاتی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس کا پینٹ بھی گھٹنوں پر سے پھٹا ہوا تھا۔

دوسرا جھروکہ: کمیشن چاہتا تو یہی ہے کہ نشانوں کے الاٹمنٹ انتخابات میں مختلف ہوں۔ لیکن جہاں اُمیدوار حد سے زیادہ ہوں سوؤں میں تب بھی ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ نشانوں کے الاٹمنٹ مختلف رہیں۔ اگر عوام ناسمجھی' کم علمی یا پھر نظر کی کمزوری کے باعث نشانوں کی پہچان میں دھوکہ کھا جائیں تو قصور کس کا الیکشن کمیشن کا تو نہیں۔ چنانچہ پارلیمانی حلقہ نلی گنڈہ میں ایسا ہی ہوا۔ بے شمار امیدواروں کو بے شمار مختلف نشانات ملے جیسے جھاڑ' پھاڑ' پھاوڑا ریت' کنکر' بادل دھنک وغیرہ وغیرہ اسی مقابلے میں صرف دو ہی اُمیدوار ایک دوسرے کے حریف اور تگڑے تھے۔ نشانوں میں ایک کو ملا چاند دوسرے کو ملا سورج' ووٹ ڈالتے ہوئے عوام چونک گئے دونوں ہی گول گول ہیں کسے ووٹ دیں۔ وہ تمیز نہ کر سکے سورج و چاند میں۔ چنانچہ جہاں چاند پاشاہ کو جیتنا تھا وہاں سورج مل جیت گئے۔ اور جہاں ہنٹر کو زیادہ ووٹ ملنے تھے گدھے کی دم کو ملے۔ جہاں سوپ کی ضمانت ضبط ہونی تھی ہاتھی کے کان کی ضبط ہوگئی۔

واہ! ری مشابہت' ثابت ہوا کہ مشابہت توام بچوں میں ہی نہیں ووٹوں میں بھی ہوتی ہے۔ شکر ہے کہ فلموں میں ہیرو ہیروئین میں کہیں سے بھی کوئی مشابہت نہیں ہوتی۔ سننے میں آ رہا ہے کہ کلوننگ کے دور میں ایسا بھی ممکن ہے۔ یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ از راہ مذاق کوئی فلمی ڈائریکٹر اس آئیڈیا سے فائدہ اُٹھالے اور ایک آئیڈیل فلم بنا ڈالے ہیرو و ہیروئین میں مشابہت کی۔ کیوں نہ ہو الیکشن میں نشانات کی مشابہت ممکن تو پھر کہیں سے بھی کسی اور جگہ (؟) ممکن کیوں نہیں۔

تیسرا جھروکہ: ڈاکٹر بھی کبھی مریضوں کے بیجا سوالات پر جھلا جاتے ہیں ان کا جھلانا واجبی ہوتا ہے یا غیر واجبی' ہوتا تو ہے ایک مریض آئے ڈاکٹر کے پاس۔ بعد از تشخیص ڈاکٹر نے انہیں قارورہ واجابت بطور نمونہ لانے کو کہا امتحان کے لئے مریض شش و پنج میں پڑ گیا کہ یہ قارورہ واجابت کیا ہوتا ہے! ڈاکٹر نے کہا پیشاب پیشاب --- اور پاخانہ! شیشی میں! پھر وہ پریشان تو ڈاکٹر نے پوچھا: اب کیا ہے! تو

وہ معصومیت سے بولا: حضور انہیں ملا کر لاؤں یا علحدہ علحدہ۔ ڈاکٹر یکدم کرسی سے اُچھل پڑا اور جھلا کر ہاتھ جوڑتے بولا: نہیں میرے باپ! دونوں کو ملا کر گھونٹ کر لاؤ۔

کچھ ایسا ہی یکساں سیول کوڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے جس کو بی جے پی سیاسی زبان دوزن میں ملا کر گھونٹنے کی باتیں کر رہی ہے جبکہ تشخیص اور مبداء دونوں ہی مذہبی ارتقاء سے الگ الگ ہیں۔

چوتھا جھروکہ: جب کبھی الیکشن کا زمانہ آتا ہے تو سیاسی پارٹیاں اس پر زیادہ زور دینے لگتی ہیں کہ اس بار کیا مدا لے کر عوام کے پاس جائیں کہ اس کو سامنے رکھ کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ بٹور سکیں۔ لیکن مشکل دیہاتوں میں یہ ہوتی ہے کہ وہ ان مدوں کو سمجھ نہیں پاتے اور پوچھنے لگتے ہیں عجیب وغریب سوالات تب انہیں سمجھنے سمجھانے میں دقت پیش آتی ہے کہ کھول کر کیسے سمجھائیں۔ اس بار دو بڑی پارٹیوں کے دو بڑے مدے تھے۔ ایک استحکام دوسرا بدلاؤ' یہ دونوں ہی مدے سمجھ نہ سکے۔ تو دیہاتی پوچھنے لگے۔ بھیا! یہ استحکام کیا ہوتا ہے اور یہ بدلاؤ کیا--؟ تو سرپنچ بھی گڑبڑا گیا کہ کیسے سمجھائیں۔ پھر ایک ترکیب سوجھ گئی اُسے اُس نے بازو چبوترے پر کھڑے گاندھی کے پتلے کے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی کو تھامتے ہوئے بولا: دیکھو! یہ استحکام ہے۔ دیہاتیوں نے معصومیت سے پوچھا: تو پھر مہاراج یہ بدلاؤ کیا ہے۔ سرپنچ نے ہنستے ہوئے کہا: بدلاؤ کچھ نہیں یہ ہے کہ تم کھانا سیدھے ہاتھ سے منہ کے پاس لے جا کر کھاتے ہو۔ اب کھانا بائیں ہاتھ سے ٹانگ کے نیچے سے لے جا کر کھاؤ۔ اس طرح پھر اس نے ٹانگ اٹھا کر بائیں ہاتھ کو ٹانگ کے نیچے سے منہ کی طرف لے جانے کی کوشش کی تو دھوتی اوپر اُٹھ گئی اور ہاتھ دھوتی میں اُلجھ کر وہ دھڑام سے گر پڑا۔ سمجھ گئے مہاراج! سمجھ گئے دیہاتی ہنسنے لگے اور اپنے شملوں کو سنبھالتے ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ بڑا مشکل ہے مہاراج یہ بدلاؤ تو۔ اپنا استحکام ہی بھلا ہے وہ گاندھی والا۔ یہ بدلاؤ تو ایک تیڑی کھیر ہے۔

پانچواں جھروکہ: میں تو سو رہا تھا' یہ عمل اتفاقاً صحیح بھی ہو سکتا ہے فطری یا پھر غلط جان بوجھ کر شرارتاً پیچھا چھڑانے غیر فطری۔ اکثر سیاسی ہستیاں اس سے بھرپور فائدہ اُٹھاتی ہیں۔ جب ان کا دامن کھینچا جاتا ہے جب وہ جاگ رہے ہوتے ہیں تو وہ دامن بچانے کہہ دیتے ہیں کہ میں تو سو رہا تھا۔ پورے نو گھنٹے تک سونا' سونا نہیں کہا جا سکتا بلکہ محاورتاً سونا بنانا کہا جا سکتا ہے یا دبکی مارنا۔ اور یہ ایک جرم ہے اس کے تئیں کہ انہیں جاگنا تھا نہ کہ سونا۔ اگر ہیرو بہانہ بنا دے ہیروئن سے پیچھا چھڑانے اور کہہ دے کہ میں تو بھیل پوری کھا رہا تھا یا لڑکی پٹا رہا تھا تو یہ ناشائستہ حرکت ہے ہیروئین کی نظر میں بھی اور ناظرین کی نظر میں بھی۔ چنانچہ ۶ رڈسمبر ۱۹۹۲ء ٹی۔ وی پر ناشستہ ودہشت گردانہ سرگرمیاں غنڈہ گردانہ حرکتیں مسجد کو گرانے

کی سب دیکھ رہے تھے اور کڑھ رہے تھے۔ میں تو سو رہا تھا کہنا کسی بھی نقطۂ نظر سے سونا نہیں کہا جاسکتا وہ بھی دن میں بلکہ ڈبکی مارنا ہوا کہ اس میں عمل دخل شامل تھا نہ کہ نیشلی گولیاں یا نشہ آور مشروب اس کی وجہ تسمیہ۔ اور یہ بہانہ کہ میں کہ میں تو سو رہا تھا اتنا طویل صاف جھوٹ کسی اسکولی بچے سے بھی ممکن نہیں، بڑے میاں تو بڑے میاں۔

چھٹا جھروکہ: انتخابات کے نتائج کسی بھی پارٹی کو تین چوتھائی کی اکثریت نہ دلا پائیں تو صدر جمہوریہ کسی بھی اکثریت والی پارٹی کو حکومت کی تشکیل کی دعوت دے دیتے ہیں اس لوازمہ کے ساتھ کہ وہ پندرہ دن کے اندر ووٹ آف کانفیڈنس ٹیبل پر لاکر یعنی جیت کر بتلائیں۔ ووٹ آف کانفیڈنس کا مطلب ہوتا ہے وفاداری کے ووٹ۔ لیکن سیاست میں وفاداریاں بدلتی رہتی ہیں۔ پیسے کے زور پر۔ آزاد اُمیدواروں کی مثال تو ایسی ہے ادھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے۔ ان کا اکثریت والی پارٹی کے لئے کوئی مسئلہ نہیں انہیں جب چاہو جیب میں ڈال لو پکے پھل کی طرح۔ مسئلہ رہتا ہے دوسری پارٹیوں سے امیدواروں کو کیسے توڑلیں۔ بہ زور زبرتو یہ ممکن نہیں چڑی ماروں کی طرح جولا بنے بمبو پر لاسا لگا کہ چڑیوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ یہاں نوٹوں کے گڈیوں کی بو سونگھانا پڑتا ہے تو وہ اس طرح سحر زدہ گود میں آگرتے ہیں جیسے کوئی پکا پھل شاخ سے ٹپک پڑتا ہے اس طرح بظاہر جو جیتا وہی سکندر رہتا ہے ووٹ آف کانفیڈنس میں۔ یعنی وفاداری کے ووٹ میں بغیر کسی لالچ کے۔ لیکن وفاداریاں چونکہ پیسے یا پوسٹ کی لالچ میں رازداری سے بدلتی رہتی ہیں اسی لئے پندرہ دن کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ ووٹ آف کانفیڈنس نہیں بلکہ ووٹ آف کانفیڈنشل ہوتا ہے یعنی رازداری کے ووٹ جو رازداری سے خریدے گئے یہی جمہوریت کی چھاپ یا برانڈ ہے جو زیادہ بکتی ہے بہ جز وفاداری جیسے بے نام لیبل کے۔

ساتواں جھروکہ: جب بھی ون مین شو (One man show) کی بات ہوگی بین خان کا مزاحیہ ڈرامہ ''ادرک کے پنجے'' یاد رکھا جائے گا۔ جس کی شمولیت گینس ورلڈ بک آف ریکارڈ میں بھی ہو چکی ہے قابل لحاظ ریکارڈ شو پیش کرنے پر۔ سیاست میں آزادی کے بعد جواہر لال نہرو اور ان کی بیٹی اندرا ون مین شو کے حق دار رہے ہیں کا شمیر میں شیخ محمد عبداللہ رہے لیکن جلد ہی سین ڈراپ ہو گیا اور وہ کاغذ پر شیر کشمیر کہلائے۔ نرسمہا راؤ ون مین ایکٹ میں ''ادرک کے پنجے'' کی طرح ''کانگریس کے پنجے'' تمثیلاً بین خان جیسے زیادہ شو نہ کرسکے اور دہشت گردی میں مسجد کو مسمار کرانے کی پاداش میں شو چھوڑ کر

درمیان سے ہی چلے گئے۔ گاندھی اور جناح تو بٹوارے کے بیک گراؤنڈ میں ہی رہے فسادات سے جو جتے آزادی کے بعد کوئی ایکٹ نہ کر سکے۔ اس وقت ہندو پاک بھی ایسی کسی ہستی سے پاک ہے جو ون مین شو کا بار اپنے کاندھوں پر اُٹھا سکے' جس میں ایک بولے سب سنیں نہ کہ سب بولیں کوئی نہ سنیں۔

اٹھواں جھروکہ: بات بہت پرانی نہیں لیکن گول ہے دنیا کی طرح گول' ہر دفعہ گھوم پھر کر پھر وہیں آجاتی ہے جہاں سے نکلی تھی۔ بات نکلی تھی کیا کبھی ہندوستانی پچ پر یا پاکستانی پچ پر کرکٹ کے مقابلے ہوں گے ہندو پاک کے درمیان اب بھی جواب منفی انداز کا ہوگا۔ یا کسی جگہ بھی ؟ اس سوال کا بھی دوٹوک انداز میں جواب مشکل ہے۔ چونکہ جب کبھی کرکٹ میں ہندو پاک کے درمیان مقابلوں کی بات چلتی ہے۔ تو شیوسینائی لیڈر رابال ٹھاکرے چپ نہیں بیٹھ سکتے کبھی پچ ہی کھدواڈالنے کی بات کرتے ہیں تو کبھی بائیکات کی دھمکی دے ڈالتے ہیں۔ اڈوانی جی نے ایک سال انہیں ایسا نہیں کرنے سے روکا تھا تو وہ مان گئے تھے۔ سوال ہے کسی سال اگر اڈوانی جی مرکز میں نہ رہیں تو؟ مرکز میں اڈوانی جی رہیں یا نہ رہیں مہاراشٹرا میں تو بال ٹھاکرے ہی رہیں گے۔ منہ سے پائیپ کا کالا کالا دھواں چھوڑتے کہیں گے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی پائیپ و تمبا کو میرے آگے

یا پھر۔

رہنے دو ابھی بال و بلا میرے آگے

نواں جھروکہ: کوئی بات پرانی نہیں ہوتی نئی ہی رہتی ہے صرف اس پر سے دھول جھٹکنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بات ایک بل کی ہے دھول سے اٹی خواتین کی خواتین کے تحفظات کی۔ دراصل یہ انتخابات میں خواتین کے لئے محفوظ حلقوں کی تھی تحفظات کو چھوڑ کر۔ جب کہ سرکاری نوکریوں میں ہر جگہ پچھڑے طبقات کو تحفظات دئے گئے۔ اسی طرح انتخابات میں بھی پچھڑے طبقات کی خواتین کی بھی تحفظات دینے بل میں صراحت کی مانگ کی گئی تھی تو اختلاف ہوا۔ اعلیٰ ذات خواتین کی طرف سے سوال ہے اعلیٰ ذات خواتین کی طرف سے ہی کیوں؟ اس کا کوئی بھی جواب ایک طرح سے راست مقابلہ حُسن میں پوشیدہ ہے جس میں برہنگی ایک آرٹ ہے۔ اور خواتین تحفظات بل بھی ایک آرٹ

ہے جس میں جنسی آزادی بھی شامل ہوسکتی ہے' برہنگی کی طرح۔ یہی وہ (برہنگی) رکاوٹ ہے جو خواتین کی زمرہ بندی میں خواتین تحفظات بل میں بلی کی طرح آڑے ہے۔ یہ ایک نیک شگون ہے۔

دسواں جھرو کہ: اگر ہم یہ تصور کریں اور بجا تصور کریں کہ جنم بھومی پروگرام بھی ایک نوٹنکی ہے تو چندرا بابو نائیڈو اس میں ایک ماہر نوٹنک باز ہوئے جس میں وہ کبھی بھی کسی بھی وقت کسی بھی موضوع کو لے کر سرکاری کرمچاریوں جن میں اکثریت بڑے بوڑھوں و بیمار ادھیکاریوں عورتوں و مردوں دونوں کی رہتی ہے بچوں کی طرح ادھر اُدھر دوڑاتے ہاتھوں پر نچاتے رہتے ہیں۔ جسے یہ جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ ڈور سے بندھی کاٹھ کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں موصوف کا اصل مقصد عوام کی توجہ مہنگائی بے کاری' خانگیانے کے عمل سے ہوئی ٹیکسوں کی بھرمار سے ہٹانا ہے۔ کچھ اور بھی شعبہ جات ہیں جیسے واٹر ورکس' آر ٹی سی دیگر محکمہ جات کو خانگی سیکٹر کے حوالہ کر کے عوام کو پوری طرح نچوڑ لینا ہے۔ دراصل ایسی نوٹنکیوں سے عوام پریشان ہی رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے عوام کی دولت کا جو لوٹ کھسوٹ سے جمع ہوئی ہے۔ بیجا استعمال ہے۔

۹ رجنوری ۲۰۰۱ء

بات ایک نوٹنکی کی ہے جس میں انہوں نے اسکولس کے تمام بچوں و سرکاری کرمچاریوں کی مدد سے اختتامی مرحلہ میں ایک انسانی زنجیر بنائی اور حلف لیا وہی مقصد عوامی توجہ ہٹانے کا تو اس پر ایک شعر موزوں ہے میاں غالب کا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

اس انسانی زنجیر کا تکلیف دہ پہلو چار مینار مین روڈ (شاہراہ) سے ہٹ کر سب وے (Sub way) گلی کوچوں میں دیکھنے کو یہ ملا یہ کہ بڑی بڑی گاڑیاں' آٹو رکشے' ٹو وہلیرز وتھری وہیلرز' ڈبیکلز کے بمپر ایک دوسرے سے جڑے اس طرح کھڑے ہارن پہ ہارن بجا رہے تھے راستہ دینے کیلئے تو مشاہدہ اس کا غماز جیسا لگ رہا تھا کہ وہ بھی ایک زنجیر میں حلف لے رہے ہیں اب کی بار اُن کو مشورہ ہے کہ وہ سلمس سے ننگے بھوکوں کی ایک زنجیر بنائیں اور حلف دلائیں کہ وہ ہائی ٹیک سٹی کے باسی ننگے بھوکے نہیں پیٹ بھرے ہیں اور یہ نوٹنکی نہیں حقیقت سے بہت دور ہے۔ دراصل یہی وہ بجا تصور ہے جو جنم بھومی پروگرام کو نوٹنکی کے زمرہ میں لے آتا ہے۔

گیارھواں جھروکہ: مرکز وریاستوں میں فنڈز کی ادائی واجرائی میں اکثر نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔ حال ہی کی بات ہے کہ پکوان گیس اور کیروسن پر بڑھی چڑھی قیمتوں پر عوامی احتجاج کو دبانے مرکز نے دس روپئے اور ایک روپیہ کی کمی کر کے بالترتیب سخاوت میں خود کو حاتم سمجھ لیا تو ریاست آندھراپردیش کے چیف کو اچھا نہ لگا کہ یہ کیا کمی نمک کے برابر' کمی عوام کی جیب کی استطاعت کے برابر ہونی چاہیے۔ عوام کی ہمدردی میں انہوں نے مرکز کی بے نام سی سخاوت کو نظرانداز کر کے مرکز کو پچاس فی صد پڑولیم اشیاء پر کمی کا مطالبہ ٹھونک دیا۔ مرکز نے للکارہ راست نہیں بلکہ فون پر' کدھر حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے چلے۔ پہلے اپنی ریاست میں برقی چارج میں کمی کر کے تو دیکھلاؤ آندھرا کے چیف یعنی گاما بجائے اپنے پٹوں پر (رانوں) پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرتے جو فون پر سنائی جا سکے فون کو کریڈل پر پٹخ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور داڑھی کھجاتے باہر نکل گئے کہ معاملہ برابر کا ہے ٹکر کا ہے۔

بارھواں جھروکہ: جمہوریت کا مطلب آزادی کو گولڈن جوبلی کے بعد بھی سمجھنے سمجھانے کا نہیں رہا ہے جبکہ یہ سبق رٹتے رٹتے طوطے کی سمجھ کی طرح ہماری سمجھ سے بھی بالاتر ہو گیا ہے اس سے ہٹ کر طوطے کی طرح ہم کچھ بول ہی نہیں سکتے اس بارے میں۔ اسطرح آزادی کے بعد ہم نے کیا کھویا کیا پایا ہے تو طوطے کی طرح بول اُٹھیں گے۔ کچھ نہیں کچھ نہیں اس کچھ نہیں کا ایک واقعہ سن لیجئے کہ آندھرائی ریاست میں' ریاستی چیف کے ایک قریبی رشتہ دار ایک ٹریفک کانسٹیبل کی طرف سے یہ جانے بوجھے بغیر ہی کہ موصوف کون ہے' ٹریفک قواعد کی غلطی بتلانے پر موصوف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زوردار تھپڑ بے چارے کانسٹیبل کے گال پر جڑ دیا۔ کانسٹیبل نے ڈیوٹی پر متعین سرکاری کرمچاری پر حملے کی پاداش میں انہیں پولیس کے حوالے کر دیا۔ لیکن ہوا یہ کہ موصوف سے ٹریفک کی خلاف ورزی پر اور کانسٹیبل کے گال پر جو ڈیوٹی پر متعین تھا تھپڑ رسید کرنے کے جرم میں کانسٹیبل کو ہی یہ سزا ہوئی کہ اسے فوراً وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ تبادلہ کر دیا گیا۔ یہ جمہوریت ہے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے اگر دور شاہانہ ہوتا تو دادرسی کو حکم دیا جاتا کہ وہ اسی طرح اسی گال پر موصوف کو تھپڑ رسید کر دے اسی قوت سے جما کر جس قوت سے اُس نے تھپڑ رسید کیا تھا۔ تاریخ ایسی بے مثال واقعات سے بھری پڑی ہے جس میں شاہوں نے مہاراجاؤں نے غلطی پر اپنے بیٹوں تک کو نہیں چھوڑا۔ انہوں نے ان کو وہی سزا دی جو انہوں نے دوسروں کو دی۔ لیکن ہماری جمہوریت میں کیونکر ایسا ممکن ہے! اس لئے آزادی کے بعد ہم نے کیا کھویا کیا پایا ہے تو فوراً طوطے کی طرح بول اُٹھیں گے: کچھ نہیں کچھ نہیں---!!

تیرھواں جھروکہ: معلوم نہیں لوٹو پوٹو کب اردو زبان میں محل وموقع سے ذرآیا۔ تاہم یہ بستر سے متعلق ہے ہم بستری سے نہیں۔ تاہم اکثر بڑی بوڑھیاں دولہا دلہن کو یہ دعا دیتی ہیں کہ خوب لوٹو پوٹو اور بچے پیدا کرو۔ فیملی پلاننگ کے اس دور میں اب وہ بڑی بوڑھیاں رہی ہیں نہ وہ خوشحالی جو دلہنوں کو ایسی تکلیف دہ دعا دیں۔ لیکن حکومت نے لوٹو کو نکال کر پوٹو ایک تکلیف دہ قانون سبھی پر لاد دیا ہے جس میں پولیس کو زبردست اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ کہیں بھی، کسی وقت بھی کسی کو بھی صرف شبہ کی بنیاد پر، بستر سے اخبار پڑھتے ہوئے، ضرورت کو جاتے ہوئے، ضرورت کرتے ہوئے بھی، اس قانون کے تحت اُٹھا لے سکتے ہیں ناڑا باندھتے ہوئے یا ناڑا باندھے بناء اس قانون کے اڈوانی جی یوں ہی زبردست مداح ہیں کسی نے کہا ہے ان کا تو پوٹو جینک چہرہ ہے ہمارے وزیراعظم کو چھوڑیئے وہ گھٹنوں کے درد کی وجہ سے اور ان کے دوسرے رفقاء تو کسی نہ کسی درد یا امراض خبیثہ میں گھرے گھر کی مسہریوں سے دور پوٹو کے پیچھے پڑے ہیں۔ اس قانون میں چونکہ جنس کی کوئی تمیز نہیں اس لئے جنس لطیف لطف سے بے نیاز کردیتیں بدل سکتی ہیں بستروں میں اور پولیس جو اکثر گھروں سے دور، بستروں سے دور انتظامی امور میں جٹے رہتے ہیں وہ اس قانون کا جنسی استحصال کرسکتے ہیں اور اس میں انہیں کوئی مانع امر نہیں کہ یعنی ''پوٹو'' والا جب بھی دے گا چھپر پھاڑ کے نہیں، کپڑے اتار کے دے گا۔
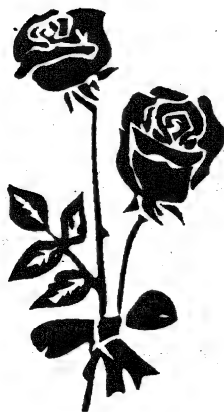
سات طویل نظمیں

۱۔ مسلمان اور مساوات

۲۔ وہ کوئی اور نہیں

۳۔ روشنی کا سفر

۴۔ انسدادِ جہیز قانون

۵۔ تلنگانہ تحریک

۶۔ بس یہی ہے زندگی!

۷۔ شیطان کرتا کچھ نہیں سب کرواتا ہے۔

مسلمان اور مساوات

دیوی پرشاد مصر ہندی کے ایک جانے مانے کوی ہیں ''مسلمان'' کے عنوان سے انہوں نے ہندی میں ایک نثری نظم لکھی تھی جس کا ترجمہ اردو زبان میں بھی کیا گیا۔ اس نظم ''مسلمان اور مساوات'' میں مَیں نے اسی بحر میں ماضی، حال و مستقبل کو رکھ کر تاریخی حقائق پیش کیئے ہیں اس تیقن کے ساتھ کہ اس کو بھی پسند کیا جائے گا۔

وہ مسلمان تھے
وہ آریوں کی طرح ہی آئے
مشرق سے نہیں مغرب سے آئے
گھوڑوں کی پیٹھوں پر سوار
ہاتھوں میں مساوات کا علم تھامے
مساوات! مساوات!! چلاتے آئے
وہ جب آئے تو یہاں ایکتا کا ماحول نہ تھا
سب پھنسے ہوئے تھے اونچ نیچ
بھید بھاؤ کے چکرویو میں
چھوت، اچھوت، ذات پات کے دلدل میں
دراصل وہ مسلمان تھے
ملیچھ نہیں
وہ آئے اور نرم دھوپ کی طرح پھیل گئے
اس نرم دھوپ میں شودر بھی آئے دلت بھی
کمّار بھی آئے اور ہریجن بھی
وہ آریاؤں کے ظلم سے تنگ آچکے تھے

وہ سب بلکہ ان میں سے بیشتر
مل گئے مسلمانوں میں
اور مسلمان ہو گئے
کھڑے ہو گئے وہ سب ایک ہی صف میں
میناروں کی مسجدوں میں
گنبدوں کی مسجدوں میں
عبادت میں مصروف
مسلمانوں کے کندھے سے کندھے ملا کر
اور بولنے کیا لگنے لگے
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
اس طرح وہ سب ایک تھے
ایک ہیں

سوچ سکو تو سوچو
وہ کہاں سے آئے
اور کون ہیں
ان کا طرز تعمیر بھی ویسا ہی تھا
ہو بہو ویسا ہی نہیں تو
کم از کم دو تہذیبوں کی آمیزش سے
بالکل ویسا ہی
جیسے مہارانی جودھا بائی
اور اکبر کا ملاپ جن کی
خونی آمیزش سے ہوا تھا
شہزادہ سلیم یعنی شیخو وغیرہ وغیرہ
بے شک ان کے پرکھے بٹے ہوئے تھے
کئی خاندانوں میں
وہ سید بھی ہوئے شیخ بھی
پٹھان بھی ہوئے مہدی بھی
اولیاء بھی ہوئے ولی اللہ بھی
وہ سب وچار عقیدے اور
سوچ کے دھنی بھی تھے
جو ایک کے بعد ایک سوچوں کے سمندر سے
موت کی آغوش میں سوتے چلے گئے
آج بھی وہ اسی طرح سو رہے ہیں
اپنے مدفونوں میں
جگہ جگہ ان کی یادیں بکھری پڑی ہیں
جیسے خواجہ معین الدین چشتیؒ
نظام الدین اولیاءؒ امیر خسرو

جن کے مدفن آج بھی
وجدان کے مرکز ہیں
اور گونج رہی ہیں
پیر فقیروں کی قوالیاں
"کرپا کرو مہاراج"
درگاہوں میں چھلوں پر
لئے تال ڈھول تاشوں کی گونج میں
وہ وجد میں آتے ہیں
اور وجد میں آکر سب کچھ بھول جاتے ہیں
الوہی جذبات سے سرشار
خودی میں کھوئے ہوئے
خودی کو بلندی کیئے ہوئے
وہ مسلمان ہیں
وہ مسلمان ہیں
ورتمان ہیں
ایک ہاتھ میں تلوار
دوسرے ہاتھ میں ترازو تھامے
وہ کوئی اندھا قانون نہیں
وہ مسلمان ہیں
رتھ یا گھوڑے پر سوار
کوئی دہشت گرد نہیں
وہ مظلوم ہیں

انصاف!! انصاف!! چلاتے رہتے ہیں
دہشت، تشدد، ظلم کے خلاف
گھروں کے لوٹے جانے، مکینوں کے اس میں
زندہ جلا دیئے جانے کے خلاف
پی اے سی کی گولیوں کے خلاف
پوٹو کے غلط استعمال کے خلاف
نوکریوں میں کم فی صدی کے خلاف
تعلیم میں عدم مساوات کے خلاف
نظم و نسق کی اونگھ کے خلاف
وہ اکثر چلاتے رہتے ہیں انصاف! انصاف!!
معلوم نہیں کب تک اسی طرح
وہ چلاتے رہیں گے
اس لئے کہ وہ مظلوم ہیں
وہ مسلمان ہیں
وہ مسلمان ہیں
موتی کی طرح سچے
ماں کے دودھ کی طرح پوتر
وہ اپنی ماں کو کیسے بھول سکتے ہیں
بار بار انہیں بھول جانے
اور بھلا دیئے جانے کی کوشش
عقیدے کا بہانہ بنا کر
مسجدوں و میناروں کو
مسمار کیئے جانے کی کوشش
ان سے شہریت کے سوال پوچھ کر
ووٹ مانگنے کی ٹیکٹیں تو ہو سکتی ہے

رام راج نہیں
ہندوتوا تو ہرگز نہیں
"سچ کو سچ کی طرح سنا جائے
تو سنو!"
وہ مسلمان ہیں
اور فخر سے یہ بھی کہتے ہیں کہ
وہ اہل ہندوستان ہیں
وہ کہیں سے نہیں آئے
وہ کہیں نہیں گئے
وہ کہیں نہیں جائیں گے
وہ یہیں ہیں یہیں رہیں گے
اپنی ہی ماں کے وہ سپوت

وہ مسلمان ہیں
وہ اہل ہندوستان ہیں

یکم اکتوبر ۲۰۰۱ء

زہرہ مسحور

وہ کوئی اور نہیں

اخباری اطلاعات پر مبنی ایک واقعاتی نظم

جب بھی مہینہ تیر کا ہو
جب بھی سورج عین سر پر ہو
بڑے بوڑھے کہتے ہیں بچوں سے
چیل انڈے دیتی ہے
ننگے سر باہر نہ نکلو
ہم بھی ایسی وارننگ سے
بقول ان کے باہر نہ نکلے تھے
تیر کا مہینہ ہو
اور دھوپ عین سر پر ہو
اسی ادھ بدھ سچائی کو
آج دیکھا ٹی۔وی پر تو
دنگ رہ گئے!
مہینہ تیر کا بھی نہیں
سورج عین سر پر بھی نہیں
دو پلین
بھاری بھرکم چمکدار پلین
اڑتے اڑتے چیلوں کی طرح
گھس پڑے فلک بوس عمارت میں

یکے بعد دیگرے
اور انڈے دے دیئے
بھڑک اُٹھی فلک بوس عمارت شعلوں سے
اور پلک جھپکتے کچے اینٹوں کی طرح
ڈھے گئی
یہ عمارت تھی
نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی
ایک اور عمارت جل کر خاکستر ہوگئی
یہ عمارت تھی
واشنگٹن میں دفاعی پنٹاگن کی
اس دھکے سے
امریکی صدر بش جیسے دھل گئے
کئی دنوں تک ان کے چہرے سے
دہشت کے سائے
آتے رہے جاتے رہے
اور وہ دن رات سوچتے رہے

ایک بے نام سایئے کے تعلق سے
جو بن لادن ہیں
ایسی دہشت گردی سے
جن کا کبھی کوئی مطلب نہیں رہا ہے
بی۔ یس۔ یف نے پکی رپورٹ بھی دی تھی
موساد کی کارستانیوں کی
جو عمارت خالی کر چکے تھے
گرنے سے پہلے
اور وہاں سے
گدھے کے سر سے
سینگ کی طرح غائب ہو گئے تھے
وہ سب خوشیاں منا رہے تھے
اور ٹھٹھا اُڑا رہے تھے
دور کھڑے ہاتھوں میں کیمرے تھامے
ویڈیو گرافی میں مشغول
اس سمندھ میں بش جیسے
تین بندروں کی طرح چپ تھے
کچھ نہ بولو کچھ نہ دیکھو کچھ نہ سنو
وہ تو صرف سوچتے رہے سوچتے رہے
دن رات بن لادن کے تعلق سے
جو چھپے بیٹھے ہیں
افغانستان کے کوہوں میں
ریگستانوں کے کھنڈروں میں
ریت کے ٹیلے نما غاروں میں
انہیں پکڑنا ہے

زندہ یا مردہ
بالآخر وارننگ دے دی
افغانستان کو
بن لادن کو ہمارے حوالے کرو
یا جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ
افغانیوں کے صدر ملا عمر بھڑک اُٹھے
شملے کے سرے کو منہ میں دبائے بولے
اسلام پہلے ثبوت مانگتا ہے
ثبوت دو پھر بن لادن کو پوچھو
ہم ریگستانوں میں رہنے والے
مرغی' بکری' اونٹ' پالنے والے
ایسی ٹیکنا لوجی ہم کیا جانیں
پلک' جھپکتے پوری فلک بوس عمارت ہی
زمین میں دھنس جائے
جاؤ پہلے اپنے گریباں میں منہ ڈالو
پھر بن لادن کو پوچھو
بن لادن بھی بیان دیتے رہے دیتے رہے
یہ ہم نہیں ہیں یہ ہم کبھی نہیں رہے
جس کو تم کھوج رہے ہو
وہ تمہارے بغل میں رہا ہے
بغل میں بچہ افغانستان میں ڈھنڈورا !!
لیکن سنتا کون---!

مہینہ تیر کا بھی نہیں
اور سورج عین سروں پر بھی نہیں
رات کا وقت رات کی تاریکیوں میں
افغانستان کے آسمانوں میں
آسمانوں سے زمین تک
زمین سے آسمانوں تک
آگ کے گولے برستے رہے
ہزاروں خواتین و بچے
پناہ کی تلاش میں
اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے
خوفناک طیارے دندناتے اُڑتے رہے
چیلوں کی طرح لپکتے جھپٹتے
اپنے چمکدار بھرے بھرے پیٹوں سے
انڈوں کی طرح لگاتار
ہزاروں بم گراتے
بھاری بھرکم طیارے
چنگھارتے گڑگڑاہٹوں سے
زمین کو لرزہ براندام کرتے
زلزلوں کی طرح زمین کو جھٹکے دیتے
عمارتوں کو ڈھیر کرتے رہے
کیا بچے کیا بوڑھے
سبھی لقمۂ اجل ہوتے رہے
قیامت کا سایہ منظر
ہر دن صبح و شام
ساری دنیا دیکھ رہی ہے

اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے
ٹی۔وی پر
چپ چاپ دم سادھے
کوئی بولتا نہیں
جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہے
بچے چیخ رہے ہیں زخموں سے
زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہیں
دلاسا دینے والا کوئی نہیں
قبریں کھل گئی ہیں
لگاتار دھماکوں میں
ہڈیاں بکھری پڑی ہیں
یا اللہ! یہ کس نے ہمیں جگا دیا!!
کیا قیامت آگئی!
بڑے بوڑھے کہتے ہیں
سوا نیزے پر سورج ہوگا
جب قیامت آئے گی
جب حد سے زیادہ ظلم بڑھ جائے گا
قیامت قائم ہوگی
اللہ کے حکم سے
مسٹر بش! مت بھولو
قیامت برحق ہے
وہ صرف افغانیوں کے لئے نہیں

جیسا تم سمجھ رہے ہو کر رہے ہو
وہ ساری دنیا کے لئے ہو گی
ان کے لئے بھی
جو دیکھ رہے ہیں بولتے کچھ نہیں
سوچ سکو تو سوچو
اپنا سر ریگستان کی ریت سے باہر نکالو
شتر مرغ کی طرح ریت میں سر کیوں دبائے ہو
دیکھ سکو تو دیکھو
تمہارے انڈوں سے نکلا وہ دیو پیکر
بھوکا پیاسا دیو پیکر
زمینوں پر پنجے گاڑے وہ دیو پیکر
کھڑا ہے
اس کی آنکھیں آگ اگل رہی ہیں
اس نے اپنی لانبی گردن
اور لانبی کر کے
اپنی سخت اور بڑی چونچ میں
راکٹوں کو پکڑ لیا ہے
تم اپنی فلموں میں یہ سب دیکھلا چکے ہو
چھوٹے کو بڑا کر کے دیکھلانے میں
تم بڑے ماہر ہو
اب دیکھو کیمرے کی آنکھ سے نہیں
اپنی حقیقی آنکھ سے
وہ تمہارا چھوٹا سا بچہ
نٹ کھٹ چھوٹا سا بچہ
اب جوان و طاقتور ہو گیا ہے
حقیقی معنوں میں وہ
دہشت گرد ہے
افغانی نہیں دیگر مسلمان تو کبھی نہیں
وہ پلینوں کو اڑانے والا
پلینوں کو ٹاور میں گھسانے والا
وہ کوئی اور نہیں
اسرائیل ہے!! اسرائیل ہے!!
اسرائیل ہے--!!

۲۵/اکتوبر ۲۰۰۱ء

زہرہ مسحور

روشنی کا سفر

صبح کی پہلی کرن
فلک سے زمین کی طرف
مصروفِ سفر رہتی ہے
اور زندانِ دل کے کسی روزن سے
یہ کرن تمثیلاً
سینے میں اترتی اجالا کرتی رہتی ہے
تو ایک انگڑائی توڑتا ہوا
ادھ کھلی آنکھیں ملتا ہوا
میں جاگ اُٹھتا ہوں
نیند سے
ہر ذی روح کی طرح

اور پھر
رات کا پہلا اندھیارا
فلک سے زمین کی طرف
مصروفِ سفر رہتا ہے
اور زندانِ دل کے کسی روزن سے
یہ اندھیارا تمثیلاً
سینے میں اترتا اجیالے کو سمیٹتا رہتا ہے
جیسے دھوپ آنگن سے سمٹتی چلی جا رہی ہو
تو کسل مندی میں ڈوبا ہوا

بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو ملتا ہوا
میں سو جاتا ہوں
خاموشی سے
ہر ذی روح کی طرح

یا پھر
صبح کی پہلی کرن ہو
یا رات کا اندھیارا
دل کے کسی روزن سے یہ کبھی
تمثیلاً
سینے میں اتر نہ پایا ہو
جسے دل کے سبھی روزن بند ہوں
کھل نہ پائے ہوں
اور آنکھیں بھی ٹھہری
پلکیں بھی جھپک نہ پائی ہوں
تو میں!
ہرِ ذی روح کی طرح
غیر متحرک وِ ساکت جسم کو چھوڑ کر
دن ہو یا رات کسی بھی پہر

زمین سے فلک کی طرف
محوِ پرواز رہونگا
روشنی کی طرح
مصروفِ سفر
ایک مسافر کی طرح
ان دیکھی منزل کی طرف
ایسا ہوتا آرہا ہے
صدیوں سے
ایسا ہوتا رہے گا
آگے بھی

روشنی کا یہ سفر
کبھی ختم نہ ہوگا

۲۴ر فروری ۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

انسداد جہیز قانون

کہتے ہیں A-498
انسداد جہیز قانون
ایک اچھا قانون ہے
یہ ایک عام تأثر
بن گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے
یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے
اندرا گاندھی نے متعارف کروایا تھا
جو نہ صرف ڈکٹیٹر تھیں
بلکہ وہ!
مردوں کو کیسے دبایا جا سکتا ہے
خوب جانتیں تھیں
کہتے ہیں تمام مرد ان کے سامنے
چاہے سیاسی ہوں یا غیر سیاسی
پانی بھرا کرتے تھے
اور ڈر کر دم ہلایا کرتے تھے
کہ ان کا اچھا خاصہ سیاسی کیریر
کہیں تباہ نہ ہو جائے
کہیں ان کا قد رآور سیاسی موقف
گر نہ جائے
ایسی خاتون کا

نکالا گیا قانون
اسی بات کا ضامن تھا کہ
کوئی بیوہ عورت
اپنے مردہ مرد کے ساتھ
چتا پر نہ جلے
دراصل یہ قانون
ستی کی رسم کو توڑنے
مدون کیا گیا تھا
اس میں شامل زیادتی سے
ایک اور شوشہ جوڑ دیا گیا کہ
کوئی جہیز نہ مانگے
نہ کوئی جہیز دے
بناء کسی سوجھ بوجھ کے

آخر جہیز ' چیز کیا ہے؟
دیکھیں
جس کا قانون A-498 کی تدوین کے بعد
بہت چرچا ہے

جہیز وہ چیز ہے، جیسے
چوبینہ لکڑ ھکڑ
بنا مانگے بناؤ سنگھار کا سامان
اس میں سنگھار میز، کرسی
آرائش وزیبائش کا سامان
لپ اسٹک، غازہ پوڈر
کچھ ساڑیاں، زرتار کی
کچھ زیورات طلائی نقرئی
سب کے سب خصوصیت سے
لڑکی کیلئے اور
اسکوٹر یا کوئی بھی گاڑی
لڑکی کو
گھمانے پھرانے
میکہ لانے لے جانے
تفریحیں منانے کے لئے
یہ ہے جہیز اور اس کا خلاصہ
تاہم!
کبھی آپس میں ان بن ہو
یا لڑکا لڑکی کی انگلیوں پر
ناچ نہ سکا ہو
کبھی کسی بات پر ہو یا نہ ہو
ان کہی ہو
بات کا تبنگڑ کیسے بنتا ہے
جہیز کو لے کر
یہ بھی دیکھیں
وہ سب آتے ہیں میکے سے

چپکے چپکے چوری چوری
اول فول بکتے، ٹوکتے للکارتے
اور کسی بھی بات پر
بات نہ بات کی دُم
پوچھا جاتا ہے لڑکے سے
جرح کے سے انداز میں
میاں! ہم نے گاڑی دی تھی کہ نہیں
بولو! کتنی فلمیں دیکھلا لائے
کہاں کہاں تفریح کرالائے
نہیں نہ
پھر اپنی طرف سے
گانا خود بجانا خود جیسے
انداز میں بولا جاتا ہے
"بس چھوڑ دو لڑکی کو
یا لڑکی کے ساتھ رہو
یہاں نہیں، ہمارے ساتھ چل کر
"میرے بوڑھے ماں باپ بیمار
وہ کس کے سہارے؟"
اس سوال کا ہر جگہ
ایک ہی جواب ہوتا ہے
"بھاڑ میں جائیں سب"
ساتھ ہی لڑکی کو اُٹھا لے جاتے ہیں وہ سب
یرغمال بنا کر

یوں ہی ہوتا ہے
یوں ہی ہوتا آرہا ہے
یہی!
498-A کی شروعات ہے
بس آگے! کچھ ہی دنوں بعد
498-A
کسی غنڈے کی طرح
بھیس بدلا
اُن میں
گلے میں دستی باندھے
پی کیپ کی سی ترچھی ٹوپی لگائے
آدھمکتا ہے
ساتھ پولیس کے
لڑکی کی جھوٹی شکایت پر
پولیس اسٹیشن میں یا عدالت میں
اور راتوں رات
سوتوں کو جگا کر
نیند میں سے اُٹھا کر
سب کو گرفتار کرلیا جاتا ہے کہ
انہوں نے جہیز مانگا تھا
سب نے مل کر لڑکی کو مارا پیٹا تھا
اور ڈھکیل کے لڑکی کو گھر سے باہر کردیا تھا
پولیس بھی اندھی آنکھیں بند کرکے
بناء انکوائیری کے
جھوٹی شکایت پر
یف آئی آر بنا کر

اُس پر اپنا ٹھپہ لگادیتی ہے
اور سب کو
عدالت کے سپرد کردیتی ہے
انصاف کی کرسی بھی
یعنی اہل کرسی اپنے
موٹے موٹے چشموں کے پیچھے سے
جس میں سے ہر چیز بڑی بڑی نظر آتی ہے
پولیس کا ٹھپہ بھی بڑا یف آئی آر بھی بڑا
بناء باریک بینی کے
لڑکے اور افراد خاندان کی
چیخ وپکار پر
ہتھوڑا مارتے ٹیبل پر
سب کو جیل میں ٹھونس دینے کا
حکم صادر کردیتی ہے
بیمار بوڑھے ماں باپ کو بھی
جو چل پھر نہیں سکتے
یہ ہے اصل کچا چٹھا 498-A کا

دراصل 498-A
مردوں کے خلاف
اندرا گاندھی کی ذہنیت ہے
کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے
498-A اندرا گاندھی کا

ذاتی شاخسانہ ہے
چلتا پھرتا کارخانہ ہے
دم دار ستارے کی طرح
چھوٹا ہوا، ہوا میں
پٹاخے جیسا
ایک جھاڑو تارہ
نحوست بھرا
چونکہ!
وہ ایک ڈیکٹیٹر تھیں
ایسے پٹاخے چھوڑنا
خوب جانتیں تھیں
کہ ڈیکٹیٹر شب بھی کیا چیز ہے؟
A-498 جس کی مثال ہے:
اس کو انہوں نے ہی مدون کیا تھا
اور وہ خوب جانتیں تھیں کہ
مردوں کو کیسے دبایا جاتا ہے
کیسے رکھا جاتا ہے پیچھے پیچھے
دم ہلاتے، سگ کی طرح
اللہ! اللہ--!!
آج......!
بدلنا ہوگا اس طرز عمل کو
بدلنا ہوگا اس قانون کو
بدلنا ہوگا اور لانا ہوگا اس کو
حقوق انسانی کے دائیرے میں
بدلاؤ لانا ہوگا اس میں کہ
کوئی عورت مرد پر ظلم نہ کرے

مل جل کر سمجھ داری سے رہے
جیسا کہ اس قانون کی تدوین سے پہلے
ہوا کرتا تھا
سب رہتے تھے راست بازی سے
مل جل کر، بناء کھوٹ کپٹ کے
محبت سے چاؤ سے
آؤ! اے لڑکو لڑکیو.
اُٹھاؤ ہاتھ اور عہد لو کہ ہم
A-498 کا بیجا استعمال نہیں کریں گے
ہم سب مل جل کر رہیں گے
جیسے ہمارے پُرکھے رہا کرتے تھے
پہلے بھی جہیز ہمارا تھا
اور ہے آج بھی ہمارا
لڑکوں کا نہیں
نہ ہی ان کا مانگا ہوا
اس بہانے اب ہم
A-498 کا بیجا استعمال
نہیں کریں گے، نہیں کریں گے
نہیں کریں گے!

۱۳ر فروری ۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

تحریک تلنگانہ

مت بھولو کہ یہ حقیقت ہے
اے آندھرا کے واسیو
اے آندھرا کے مکینو
کہ ہم
اہل تلنگانہ ہیں
تلنگانہ ہمارا ہے
یہی ہمارا نعرہ ہے
دیکھو! وہ سرخ پرچم
سرخ آنچل جیسا
بیواؤں کے سروں سے اترا
شہیدوں کے خون میں ڈوبا
لہرا رہا ہے کیسا
رنگا تھا ہم نے اسی پرچم کو اسی خون میں
شہیدوں کے اور لگایا تھا
ایک نعرہ
وہ نعرہ تھا
بلند بانگ و دہل
''نان ملکی گو آوٹ''
یعنی غیر ملکیوں چلے جاؤ
نعرے کی کرخت آوازوں میں

لرز گے تھے ایوان
لرز اُٹھے تھے در و دیوار
دہل گئیں تھیں عمارتیں
فلک شگاف نعروں کی گونجوں میں
اچانک
گولیاں چلنے لگیں تڑ اتڑ
احتجاجی نوجوانوں کے سینوں پر لگاتار
بندوقوں کی نالیوں سے
لاشوں پہ لاشے گرتے رہے
ایک پہ ایک
جیسے انسانوں کی فصل کٹ رہی ہے
یہ کوئی کھیل تھا
نہ فلم کی شوٹنگ تھی
حقیقت تھی
تم پوچھو تو پوچھو
اے آندھرا کے واسیو
اے آندھرا کے مکینو
تم پوچھو ہم بتلاتے ہیں

تمہارے بچوں کو نئی نسل کو
جو نہیں جانتے
حقیقت کیا ہے
سنو ا !
تم کیسے آئے تھے
اور کیوں آئے تھے
تم آئے تھے لاشوں کو الانگتے پھلانگتے
تم آئے تھے غیر ملکیوں سے ملکی بن کر
تم آئے تھے انضمام تلنگانہ کا
آندھرا میں پروانہ پا کر
خوشی خوشی
اپنے زیر جامہ اوپر اُٹھائے
دیکھلاتے ننگ دھڑنگ اپنے اعضاء
بے ہودگی سے اور لٹکاتے جھلاتے
اپنے ہاتھوں کو
تم آئے تھے سرحدوں کو پاٹتے
ٹڈی دلوں کی طرح بھنبھناتے
اور صفاچٹ کر گئے
ہمارے کھیت وکھلیان
تم آئے تھے برہنہ پا' ایسے ہی
اور ہمارے دفتروں میں گھس گئے
اور بیٹھ گئے کرسیوں پر
ہمارے کارخانوں میں گھس گئے
اور قبضہ کر لیا مشینوں پر
ہماری کمپنیوں میں گھس گئے
اور ہڑپ لیا کمپنیوں کو
ہمارے محکموں میں گھس گئے
نیست و نابود کر دیا محکموں کو
ہمارے بزنس سنٹرز میں گھس گئے
قیمتوں کو بڑھا گئے
اور کہیں کا نہ رکھا غریبوں کو
بہر حال جہاں جہاں گھسنا تھا تم گھس گئے
چوہوں گھونسوں کی طرح
دراڑیں ڈالتے
اتھل پتھل کرتے
چاٹتے کاٹتے قانون کی کتابوں کو
جھینگروں کی طرح
صفاچٹ کر گئے اس ورق کو
کہتے ہیں اُس ورق میں
6۔ پوائنٹ فارمولہ تھا
کہاں گیا وہ ورق
اہل تلنگانہ کی مفادات کا
سب ہضم کر گئے
اور ڈکار تک نہیں لی !
مت بھولو کہ
صرف لسانی بنیاد ہی
ہم کو ٹکڑے ٹکڑے کر گئی

ورنہ ہم
بٹنے اور ٹکڑے ہونے کیلئے نہیں تھے
آج بھی تلنگانہ ہمارا ہے
یہی ہمارا نعرہ ہے
تلگو ہماری زبان ہے
لہجہ ہمارا اپنا ہے
تلگو تمہاری بھی زبان ہے
لہجہ تمہارا اپنا ہے
تہذیب تمہاری اپنی ہے
تہذیب ہماری اپنی ہے
ہماری اپنی تہذیب میں
عزت انگ کی، عزت حیا کی
عزت شرم کی، عزت نفس کی
گنجائش ہے
کیا تمہاری اپنی تہذیب میں
ان تمام جذبوں میں عزت نفس کی
کوئی گنجائش ہے؟
خواہ کچھ ہو
تاہم!
کون کہتا ہے کہ تہذیبوں کا یہ بے جوڑ ملن سچا ہے
کون کہتا ہے کہ یہ لسانی نظام سچا ہے
لوٹ کھسوٹ بے ایمانی کا نظام سچا ہے
دغابازی ظلم وستم کا نظام سچا ہے
اس کو بدلنا ہوگا
دور ہو جاؤ

ہم وفا و حیا کے پتلے ہیں
موم کے نہیں، سخت جان و سخت قالب
ظلم سہتے آئے ہیں
ایک زمانے سے
علم کے میدانوں میں
نوکریوں کے کال سے
تہذیبوں کے ٹکراؤ میں
اب ظلم نہیں سہینگے
مت بھولو کہ ہم
اہل تلنگانہ ہیں
تلنگانہ ہمارا ہے
یہی ہمارا نعرہ ہے

یہی ہمارا نعرہ ہے
تلنگانہ ہمارا ہے۔

۲۴ر فروری ۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

زندگی کیا ہے ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ ایک دن خیال آیا زندگی مانند حباب ایک بلبلہ بھی ہے۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ ایک مختصر سی نظم ہوگئی' زندگی پر تو لگتا ہے زندگی پر یہ نظم میں نے نہیں' زندگی نے مجھ سے لکھوائی ہے۔

بس یہی ہے زندگی

ے سکو تو سمجھو !
گی مانند حباب
ے بُلبُلہ ہے
ا ہوتا ہے
لے پانی کی سطح پر
رے پانی کی سطح پر
نپتا ہے
تھراتا ہے
رڈولتا ہوا
ٹ جاتا ہے
ں جاتا ہے گدلے پانی میں
ر کوئی ایک قطرہ
کر گدلے پانی کی سطح پر
لتا ہوا گدلے پانی کو
پیدا کرتا ہے ایک بُلبلہ
زندگی بس قطرہ قطرہ
ٹپکتی ہوئی
پیدا کرتی ہوئی
رہتی ہے کیسے بُلبُلے

گدلے پانی میں
کون جانے کب کوئی بُلبُلہ
کانپتا' تھر تھراتا' ڈولتا ہوا
پھٹ جائے گا
مل جائے گا
گدلے پانی میں
کہ بس یہی ہے زندگی
گدلے پانی میں
مانند حباب ایک بُلبُلہ کی طرح
اُبھرتی' تیرتی' ڈولتی ہوئی

۲۹/مارچ ۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

گجرات المیہ سے اخباری اطلاعات پر مبنی ایک تازہ واقعاتی نظم ان واقعات کی دردناکی نے آزادی کے گولڈن چہرے پر کالک پوت دی ہے۔

شیطان کرتا کچھ نہیں سب کرواتا ہے

گودھرا میں سابرمتی ایکسپریس کا حادثہ ہو یا سازش یا گجرات میں بے شمار قتل کے واقعات' لوٹ مار و آتش زنی میں زندہ انسانوں کو جلائے جانے کے واقعات سبھی شیطانی کارنامے ہیں جو شیطان نے اپنے ناپاک ذہن میں بنائے اور انسانی ہاتھوں سے کروائے، میں نے اس نظم میں یہی بات کہنے کی بھرپور کوشش کی ہے---اگر کسی بھی انسان نے اس بات کو سمجھنے کی کوشش بھی کی تو وہ شیطانی چنگل سے آزاد ہو جائے جو انسانوں کا کھلا دشمن ہے۔

کہتے ہیں
شیطان کرتا کچھ نہیں
سب کرواتا ہے
تصدیق کرنا ہو تو کرلو
کچھ دنوں پہلے ہی
اُس نے انسانوں کو لے کر
انسانوں کو زندہ جلوایا ہے
انسانوں کے ہاتھوں
گھروں کو آگ لگوائی ہے
چھوٹے بچوں پیدائشی بچوں کو بھی
جوان عورتوں' بوڑھی عورتوں کو بھی
جلتی آگ میں جھونکا ہے
روتے بلکتے چھوٹے بچے
آہ! و بکا کرتی

جوان و بوڑھی عورتیں
جوان بچے' مرد بوڑھے
سب کے سب
چیختے چلاتے دہشت سے
آگ میں جل گئے تھے
بچانے والا کوئی نہ تھا
اور دور کھڑا شیطان
بلکہ ایوانوں میں بیٹھا موذی
داڑھی مونچھوں میں
مسکرا رہا تھا
اور ہنس رہا تھا کہ
شیطان کرتا کچھ نہیں

ب کرواتا ہے
ریق کرنا ہو تو کرلو کہ
زیوں کا ایک ٹولہ
ں بھی بیٹھا ایوانوں میں
جائے گا
یطان سے ہدایت پاتا ہوا
ہے وہ گودھرا میں
برمتی ایکسپریس کا
دثہ رہا ہو یا سازش
جگہ
یطان کرتا کچھ نہیں
ب کرواتا ہے
مدیق کرنا ہو تو کرلو
ہر گجرات کیسے جل رہا تھا
ن رہا تھا انسانی لاشوں میں
ٹ رہا تھا شہر
کر رہی تھیں عمارتیں
ور موذی الاپ رہا تھا ظلم کا راگ
ور بجا رہا تھا ظلم کی بنسی
جیسے یہ شیطان کی آماجگاہ ہے
جیسے یہ شیطان کی کٹیا ہے
کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں
شیطان کرتا کچھ نہیں
سب کرواتا ہے

تصدیق کرنا ہو تو کرلو

سابرمتی ایکسپریس میں
کون سوار تھے
کس کے بھیس میں
کون سوار تھے
جو لگا رہے تھے نعرے
گندے گندے
اور کر رہے تھے
اخلاق سوز حرکتیں
ٹرین میں
پی لی تھی چائے
بناء پیسے دیئے
کھا لیئے تھے آلو بونڈے انڈے
بناء پیسے دیئے
مانگنے پر پیسے
دی تھی ایک مسلمانی گالی
خوانچے والوں کو
اور کھینچ لیا تھا ڈبے کے اندر
ایک جوان بچی کو
بند کر لیا تھا ڈبے کو
اندر سے
پھر چل پڑی تھی ٹرین
چھک چھک چھک چھک

بچانے سب لڑکی کو لٹک گئے تھے
چلتی ٹرین کے ڈبوں سے
جھول گئے تھے سب
چلتی ٹرین کی کھڑکیوں سے
بچانے شیطان کے چنگل سے
جوان بچی کو
کہ اندر سے
شیطان کرتا کچھ نہیں
سب کرواتا ہے
تصدیق کرنا ہو تو کرلو
یہ حادثہ تھا یا گھڑی گھڑائی سازش......!

۳۰ رمارچ ۲۰۰۲ء　　　　زہرہ مسحور

امریکی کلچر کے اثرات

امریکی کلچر کے بُرے اثرات کے ضمن میں' میں یہاں دو ایک واقعات یا مثالیں وہاں کے بچوں کے تعلق سے جو میں نے کسی وقت پڑھی ہیں' اور اس میں یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی ہے' اس لئے کہ وہاں ٹیچرز بچوں کو ایسی ہی غیر اخلاقی تعلیم دیتے ہیں۔ دہرا رہا ہوں' پڑھئے اور سوچئے!

ایک واقعہ یوں ہے کہ وہاں ایک بچے نے واش روم اس لئے جلدی نہیں خالی کیا کہ وہ پہلے آیا ہے۔ یعنی I Come first اور چوراسی (84) سالہ نانا عجلت میں بے چین تھے۔ لیکن وہ واش روم جلدی خالی کرنے کیلئے آمادہ نہ ہوا۔ والدہ کے کہنے پر بھی نہیں۔ اب اس بے چینی میں نانا کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ دوسری بات ہے۔ دوسرا واقعہ اس طرح ہے کہ جب پانچ دن پہلے تیار کئے ہوئے سالن مکان میں ختم ہوگئے تو بچے نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فون پر دیگر اہلِ خاندان کو مطلع کردیا۔

یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہاں کی طرح ہم بچوں کو ڈانٹ بھی نہیں سکتے کہ امریکی قانون کے مطابق پولیس کے حوالے کردیئے جائیں گے۔ تیسرا واقعہ اس طرح ہے کہ جب کم سن لڑکی کو شرارت پر والدہ نے مارا تو اس نے فون اُٹھا کر پولیس کو مطلع کردیا۔ کیونکہ اسے استاد نے یہی تعلیم دی تھی کہ اگر تمہارے ماں باپ نے تمہیں ہاتھ لگایا تو فوراً پولیس تمہاری مدد کو آسکتی ہے۔ یہ تو امریکی بچے' بچیوں کی بات ہوئی۔

ایک ہندوستانی خاندان جو مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے وہاں کی بات ہے کہ ایک جوان لڑکی نے ماں باپ کو دھمکی دی کہ اگر اس کو پابند زندگی گذارنے اور شام میں جلدی گھر لوٹ آنے کے لئے کہا گیا تو وہ اپنے ہاتھ کی رگیں کاٹ لے کر سب کو پولس میں بند ھوادے گی۔ بہر حال ایسی تعلیم وہاں ٹیچر بچوں

لو دیتے ہیں پڑھ کر تعجب بھی نہیں ہوا کہ مغربی کلچر کو عالمی کلچر کا درجہ دینے کی ایک سیڑھی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مغربی کلچر کو وسعت دینے کی کوششوں میں جو رکاوٹیں پیدا ہوں گی یا ہو رہی ہیں وہ اسلامی کلچر سے ہے۔ اور کچھ کم نہیں ہندو کلچر سے بھی ہے کیونکہ دونوں ہی تہذیبوں میں اخلاقی جرأت کے نام پر بد تہذیبی و گمراہی کی جگہ بچوں کو بزرگوں و والدین کے ساتھ حدو مراتب کا لحاظ رکھنے کی بھرپور تعلیم دی جاتی ہے۔ جب کہ مغربی تہذیب میں اس کا فقدان ہے بلکہ یہ ہے ہی نہیں۔ اب کیا ہندو کیا مسلم ----! کچھ گھرانے ایسے بھی ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا نہ ہوں' مغربی تہذیب کا نہایت اتاؤلے پن سے پرچار کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ بنیادی تعلیم انگریزی ہونے کے ناطے فرّاٹے سے انگریزی بولیں۔ لیکن اپنی تہذیب کو ہاتھ سے جانیں نہ دیں۔ بلکہ اپنے بچوں کو بھی اپنی تہذیب سے آشنا کرائیں۔ ایک قدم اور آگے بڑھ کر سوچیں کہ اس میں بچیاں بھی ہوں گی جو آگے چل کر شادی کے بندھنوں میں بندھیں گی۔ بچپن سے ایسی ہماتمی اور بڑوں کے حدو ادب کا احساس خمیر میں نہ ہو تو ازدواجی تعلقات کا کیا حشر ہوگا! اس سے بڑھ کر خاندانی اقدار' شرافت و تہذیب کا جس طرح جنازہ نکلے گا وہ الگ...... یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں اخلاقی انحطاط میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ وہاں اخلاقی تعلیم اور خاندانی اقدار کا فقدان ہے۔ چنانچہ امریکی صدر بل کلنٹن نے 1992ء کی انتخابی مہم میں Family Values خاندانی اقدار کو ہی اپنی انتخابی مہم کا موضوع بنایا تھا' قابل غور ہے۔ اور یہ کہ معاشرہ کو اکیسویں صدی میں لے جانے کا مطلب کبھی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ خاندانی اقدار کا خاتمہ ہو۔

ہونا یہ چاہیے کہ بڑے بوڑھوں کا احترام' ان کی نگہداشت' شوہروں کا حدو ادب' بیویوں' بیٹیوں' بہنوں کے ساتھ حسن سلوک خاندانوں کی عزت و اقدار میں گراں قدر ذمہ داریاں خواتین خصوصاً بہوؤں پر ہی عائد ہوتی ہیں' نہ کہ بے جا و من گھڑت الزامات کے ذریعہ کسی بھی شرافت و عزت سے کھلواڑ اور اس کا خیال بھی رکھنا ضروری ہے کہ ہم بچپن میں بچوں کی شرارتوں' ان کی غلط عادتوں' حدو ادب سے گری ہوئی حرکتوں کو بھی بچپنا کہہ کر ٹال دیتے ہیں یا ہنس کر چپ ہو جاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی چال' ایسی فطرت' عمر کی منزلوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے تو آگے چل کر سوائے بدنامی و رسوائی کے اور کچھ نہ ہوگا۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہمارے بچوں' بچیوں کو امریکی تہذیب کی جگہ اول پہلی سیڑھی بطور اپنی تہذیب سے آشنا کرانا ہے۔

بے شک آپ انہیں انگریزی پڑھائیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں مذہبی تعلیم بھی دیں۔ پیغمبروں و بزرگان دین کے قصے سنائیں۔ تبھی وہ بہتر شہری بن کر ابھریں گے۔ جن کا باطن بھی صحیح ہوگا اور ظاہر بھی۔ بہرحال امریکی کلچر کے بُرے اثرات کا مقابلہ کیسے ہو؟ اس کے لئے اپنی شناخت اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ مذہب کی برقراری۔ یہی وہ کنجی ہے جس سے کلچر کے بُرے اثرات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔
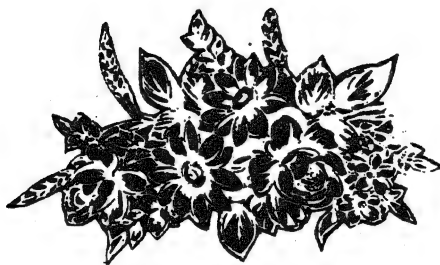
کل اور آج

جنسی بازار پر کبھی میری ایک کہانی چھپی تھی۔ شائد ۹۰ یا ۹۱ء میں ''فلمی ستارے'' دہلی سے نکلنے والے ایک مشہور ماہ نامے میں۔ اس وقت میرے پاس نہ ہی وہ شمارہ ہے اور نہ ہی اس کا مسودہ۔
کسی زمانے میں حیدرآباد میں یہ جنسی بازار 'محبوب کی مہندی'' کے نام سے موسوم تھے۔ آج بھی ہیں گنے چنے۔ ان بازاروں میں جہاں عورتیں جنس کا کاروبار کرتی ہیں اب ان عورتوں کو ''سیکس ورکرز'' کا نام دے دیا گیا ہے میرا مشاہدہ ہے اور میں نے پڑھا ہے یہ بازار نوابوں کے دور میں خاصے آباد تھے۔ اور ان بازاروں میں بیٹھنے والی جوان عورتیں ''طوائف'' کے نام سے موسوم تھیں۔ انہیں تہذیب و تمدن اور بات چیت کے ڈھنگ میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا بلکہ برجستہ مکالموں و جوابوں میں وہ اچھے اچھوں کی چھٹی کر دیتی تھیں۔ اس لئے اُس زمانے میں نواب اپنے لڑکوں کو ابتدائی عمر سے ہی تہذیب سکھلانے' بات چیت کا سلیقہ سکھلانے' ان کے یہاں چھوڑ دیا کرتے تھے۔ میں بھول نہیں رہا ہوں تو مرحوم رشید احمد صدیقی اسی بات کو اپنے مضامین میں کہیں باندھا ہے۔ میں اُن عورتوں کی ادب نوازی سے ذاتی طور پر واقف تو نہیں ہوں لیکن سنا ہے واقعہ ہے کہ کسی ادبی شخصیت کو ان کے دوستوں نے بہلا پھسلا کر صرف گانا بجانا سننے کوٹھے پر زبردستی کھینچ کر لے گئے۔ موصوف وہاں پہنچ تو گئے لیکن گھبرائے ہوئے تھے۔ گانا شروع ہونے سے پہلے ہی ان عورتوں نے انہیں پہچان لیا فوراً بول اُٹھے ارے یہ تو وہ ہیں...... موصوف کیا کہتے۔ حیران رہ گئے۔ اپنی بلند قامتی پر کہ یہاں بھی ان کی شہرت ان سے پہلے پہنچ گئی۔ اس طرح ان عورتوں میں بھی ادبی رجحان کی چاشنی دیکھ کر بہرحال وہ دنگ رہ گئے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس دور میں جو بھی لوگ یہاں آتے تھے وہ اکثر رنگ رلیاں منانے نہیں بلکہ موسیقی و گانوں کے دلدادہ ہوتے تھے۔ اور بڑی رات تک یہ بازار اُن دنوں گانوں کی لئے' ڈھول تھاپوں اور ہارمونیم کی سریلی آوازوں سے گونجا کرتے تھے۔'
ابھی بھی وہ لوگ اس کی تصدیق کریں گے قمر ہوٹل کے اوپر اُس کوٹھے کی جہاں معزز حضرات کا جمگھٹا ہوا کرتا تھا اور رات رات بھر گانا بجانا چلتا رہتا تھا۔ حیدرآباد میں لب سڑک تھی یہ ہوٹل اور وہ کوٹھا اب نہ وہ ہوٹل ہی ہے

اور نہ وہ کوٹھا۔ روڈ (Extention) ایکٹنشن میں یہ ڈھادے گئے ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے موسیقی اور گانوں کا ٹھیکہ ٹی۔ وی ٹیپ ریکارڈ نے لے رکھا ہے یا پھر فحش البم جو ننگے گانوں اور عورتوں کی ننگی قابل اعتراض جنسی حرکتوں سے پُر ہوتے ہیں۔ اس طرح لگتا ہے جسموں کا کاروبار اور دیکھا و اگلی گلی پھیل گیا ہے' بڑی بڑی ہوٹلیں و لاج ان کے اڈے ہیں۔ یوں کل اور آج یہ فرق زیادہ بھی نہیں کہ صرف بہاؤ یعنی ڈرین (DRAIN) کے رُخ بدل گئے ہیں۔ ہوتا وہی ہے جو پہلے بھی ہوتا تھا اب بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پہلے صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا معاملہ تھا۔ اب کھلے آتے ہیں صاف چھپتے نہیں اور نہ ہی الگ سے باندھ رکھنے والا معاملہ ہے جو مال اچھا ہے وہ سامنے ہے کھلی کتاب کی طرح اس طرح نہیں کہ۔

الگ سے باندھ رکھا ہے وہ مال جو اچھا ہے

زہرہ مسحور

مغرب کا تماشہ

مس ورلڈ ـــــ مقابلۂ حُسن

مس ورلڈ۔ مقابلۂ حُسن کو ہم مغرب کا تماشہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے خلاف تحریکیں بھی چلی تھیں، زوردار احتجاج بھی ہوئے تھے، جب خود ہمارے ملک میں ایسے مقابلے ہونا شروع ہوئے، لیکن ہوا کچھ نہیں۔ اب تو مغرب کی یہ چھاپ یا برانڈ ہندوستانی تہذیب پر لگ چکی ہے۔ یہ کب دھلے گی یا مٹے گی ہماری تہذیب پر سے نئے کپڑے پر اتری چھاپ کی طرح، بتلانا مشکل ہے۔ اس لئے کہ معاشرے کو عورت کا ایسا روپ پسند آنے لگا ہے۔ تو خیال آتا ہے کپڑے مردانہ جسموں کے ہینگر کے لئے ہیں زنانہ جسموں کے ہینگر کے لئے نہیں۔ اس لئے جب کبھی زنانی اعضاء کپڑوں سے ڈھکنے کی بات کی جاتی ہے تو مردانہ اعضاء جو ڈھکے ہوئے رہتے ہیں کپڑوں سے یعنی مرد مخالفت میں پیش پیش رہتے ہیں بجائے عورتوں کے جو ڈھکی نہیں رہتیں کپڑوں سے۔ معلوم ہوا کہ مغرب کا یہ تماشہ، مس ورلڈ مقابلۂ حسن عورتوں سے زیادہ مردوں کے دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کہاوت کے الٹ کر ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، یہاں ہر چمکتی و دیکھتی چیز سونا ہوتی ہے اور نظریں کسوٹی نہیں بلکہ حُسن کی بھوکی۔ یہی مغرب کا تماشہ مقابلۂ حُسن میں پوشیدہ ہے۔

۱۲ر مئی ۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

مجموعہ ڈھاک کے دوپات ...... کیسا رہا......!

میرے پہلے مجموعے کے بارے میں جو سن ۱۹۹۱ء کا ہے' مجھے زیادہ کچھ کہنا نہیں ہے۔ جو بھی کہیں گے قارئین ہی کہیں گے مجھے صرف بتلانا یہ ہے کہ حیدرآباد میں ہوئے فسادات پر بلا کم و کاست یہ ایک پر اثر دستاویز ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سبھی دلوں کی دھڑکنیں کتاب کے مطالعے کے دوران بڑھ گئی ہوں گی اور قلوب متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے ہوں گے۔

ہماری اردو اکیڈیمی کا حال دوسرا رہا کہ انہوں نے میری اس کتاب (ڈھاک کے دوپات) کے بنڈل کو گھبرا کر الماری کے اوپر سرکا دیا۔ یعنی سیلکشن کمیٹی جو کتابوں کو انعامات کے لئے چنتی ہے ان کی نظروں سے دور رکھا۔ جانے کیوں؟

خواہ کچھ ہو

اس کتاب پر ایک شعر ہے جو اکیڈیمی کی بھی نذر ہے۔

روک سکتا ہمیں زنداں بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیواروں سے چھن جاتے ہیں

(مجروح)

۲۵ رفروری ۲۰۰۲ء

زہرہ مسحور

ہندو پاک دوستی کے نام

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شام ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے
ہوں جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنگ دشنام
طنز چھلکائے تو چھلکایا کرے زہر کے جام
تیکھی نظریں ہوں ترش ابروئے خمدار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں
بے بسی حرف کو زنجیر بہ پا کر نہ سکے
کوئی قاتل ہو مگر قتل ندا کر نہ سکے
صبح تک ڈھل کے کوئی حرف وفا آئے گا
عشق آئے گا بصد لغزش پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے، لب کانپیں گے
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی
اور پھر حرف وندا کی نہ ضرورت ہوگی
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی
نفرت اُٹھ جائے گی، مہمان مروت ہوگی
ہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے
تحفہ درد لیے پیار کی سوغات لیے
ریگزاروں سے عداوت کے گذر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے
گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شام ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

OFFICE OF THE REGISTRAR OF PUBLICATIONS
17 JUN 2002
ANDHRA PRADESH, HYD

YADOON-KE-JHAROKE

20-3-912, SHAH GUNJ JUBILEE POST, HYD-500002 (PH: 4415713) RS: 150/-

Though the book is Completely not spiritual touch but some how spiritual in the sence of human study, his desires and ambitious in different types of living, in defferent types of human beings.

ZEHRA MASHOOR

یہ قابل تعریف بات ہے کہ دلتوں کی نمائندگی کرنے والی غیر سکاری تنظیموں نے جلسے جلوس و ریالیوں کے ذریعہ اپنی بات کو ڈربن میں جاری انسداد نسل پرستی' متوازی کانفرنس کے اعلامیہ میں ہندوستان کی ذات پات کے امتیاز کو ایک فقرے کے طور پر شامل کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس پر ڈربن کانفرنس کی سکریٹری جنرل میری رابنسن کو کہنا پڑا کہ بین الاقوامی برادری نے پہلی مرتبہ ہندوستان کے دلتوں کی آواز سنی ہے جبکہ ہندوستان کے سرکاری وفد' معتمد خارجہ چوکیلا ائیر کی جانب سے اس کوشش پر اعتراض کیا جارہا ہے۔ ظاہر ہے ہماری اندرونی پالیسی کچھ اور ہے اور بیرونی پالیسی کچھ اور' اس تفریق پر بھی کہیں کوئی اعتراض بھی ہوتا ہے تو داخلی معاملہ کہہ کر چپ کرادیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے قومی انسانی حقوق کمیشن نے ڈربن میں یہ کارنامہ کردکھایا اس پر انسانی حقوق کمیشن کی سربراہ میری رابنسن نے جو عالمی کانفرنس برائے انسداد نسل پرستی کی سکریٹری جنرل بھی ہیں ہندوستان کے قومی انسانی حقوق کمیشن کے اختیار کردہ اس اصولی موقف کی ستائش کی ہے تاہم یہ بھی کہا ہے کہ اگر یہ فقرہ ہندوستان کی مخالفت کے باوجود اعلامیہ میں شامل نہ ہو تب بھی دلتوں کا کاز اس کانفرنس میں منظر عام پر آچکا ہے۔ چونکہ اس عالمی کانفرنس کے مسودہ میں کئی ایسے فقرے ہیں اور غلطیوں کی اصلاح کیلئے قانون کی تدوین پر انسداد نسل پرستی کو اجاگر کرتی ہے۔ بہر حال انسداد نسل پرستی کی کاروائیاں اس کانفرس میں جو جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن میں ہورہی ہیں کہاں تک کامیاب ہونگی کچھ کہا نہیں جاسکتا' چونکہ اس میں ہندوستان کے علاوہ مختلف ممالک میں بھی نسل پرستی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا ہے اور انصاف دلانا ہے۔

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شام ملاقات چلے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : یادوں کے جھروکے

مصنف : زہرہ مسحور

سن اشاعت : ۲۰۰۲ء

کمپیوٹر کمپوزنگ : سہیل کمپیوٹرس، چھتہ بازار، حیدرآباد Ph: 6710795

ناشر : صفیہ انور 20-3-912 شاہ گنج، جوبلی پوسٹ، حیدرآباد۔۲

: اکاؤنٹ نمبر: 01190015420 اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد

برانچ حسینی عالم، حیدرآباد

طابع : فرح پرنٹرس، یوسف بازار، حیدرآباد Ph No: 4578722, 6711727

قیمت : ایک سو پچاس روپے Rs. 150/-

باختیار تقسیم کار

رہبر کارنر 2936 کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی 110006

ملنے کے پتے

۱۔ رہبر کارنر 2936 کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی 110006

۲۔ حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد۔500 002

۳۔ زہرہ مسحور 20-3-912 شاہ گنج، جوبلی پوسٹ، حیدرآباد۔۲ (اے پی) فون نمبر: 4415713